

سلسلہ دارالاصنافین
نمبر

برکے

اڈل

جس میں برکے کی مکمل سوانح، اس کی فلسفیانہ تصنیفات کی ناقذانہ تلخیص
اور اُسکے "فلسفہ تصویریت" کی تشریح و تہقیر

از

(اسٹنٹ) پروفیسر عبدالباری ندوی

استاذ فلسفہ کلیہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن

باہتمام سعود علی ندوی



درمطبع معارف اعظم گڑھ پبلیکیشن

طبع دسمبر ۱۹۶۲ء ۶۱۰۰ جلد

انتساب

میری انگریزی کی تحصیل بہت کچھ میرے محترم بزرگ
خان بہادر شیخ مقبول حسین سی، آئی، ای، تعلقدار گدیہ
کی رہین کرم ہے۔ لہذا منت پذیر می کا تقاضا، اس زبان
کا سب سے پہلا استفادہ نذرین پیش کرتا ہے، ۶

مگر بعین عنایت قبول فرماید

”عبدالباری“

فہرست مضامین

دیباچہ

سوانح

۲-۱

تہد

لڑکپن برکے کو آئرش فلسفی کہنا درست نہیں، غار ڈنور۔ پچانسی کی
آزمائش۔ کتاب تعلیقات۔ ذہنی زندگی کا مالو۔

۱۳-۲

عہدِ ”جدید نظریہ رویت“۔ ”مبادی“ کے ساتھ معاصرین کی بے اعتنائی
برکے کی ذات میں مذہب و فلسفہ کا دوش بدوش اجتماع تدریسی اور
کلیسائی خدمت۔ اطاعت غیر مفادمانہ برد عطا سفر و سیاحت۔ آزاد
خیالوں کے خلاف گارجین میں مضامین، مکالمات، انٹرویو کی اشاعت
فرانس و اٹلی کا سفر۔ روزنامہ سیاحت۔ نظر کی ہمسگری، بیٹیکان
لائبریری کی سیر۔ بحر جنوبی کا فتنہ۔ بے سان گمان دولت۔ جزائر
برمودا میں کالج قائم کرنے کی اسکیم۔ جزیرہ رہوڈ۔ دہائٹ ہال۔
لندن واپس۔ آرزوئے عزت منصب بے شپ۔

۴۳-۱۳

عزالت خدمت وطن۔ لائڈسہی کی روک تھام۔ اقتصادی اصلاحات۔
”مستفسر“ مقالہ بنام حکام۔ انسان کے اعمال اُسکے خیالات کا

نتیجہ ہوتے ہیں، ایک دقیق نکتہ۔ موت کا کارخانہ۔ ما، الفیر کے
متعلق طبی تحقیقات۔ نناعت و خودداری۔ اولاد کی تسلیم

و تربیت۔ موت۔

۵۷-۴۳

تصنیفات

۱۔ ”جدید نظریہ رویت“

۷۲-۵۹

۲۔ مبادی علم انسانی

۸۲-۷۲

۳۔ ”مکالمات امین ہائلس و فلونس“

۸۴-۸۲

۴۔ ”طبیاتو“

۸۵-۸۴

۵۔ ”مکالمات السیفارن“

۹۱-۸۶

۶۔ ”سرس“

۹۲-۹۱

برکے کا فلسفہ، صورت

فلسفہ کی حقیقت و نہا ہب۔ فلسفہ صورت۔ پروٹاگورس
ڈیکارٹ، اور لاک کے نظریات۔ فلسفہ برکے کی تشریح

اور تنقید

۱۱۳-۹۳

عام تبصرہ

۱۱۶-۱۱۴

ضمیمہ تصورات کلیہ،

۱۲۶-۱۱۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

انگریزی برنامہ ہے کہ اُس نے لفظ فلسفہ کا استعمال نہایت ہی سُست اور پامال کر دیا ہے، اُردو پر بھی انگریزی ہی کا سایہ پڑا ہے، اور فلسفہ کا لفظ ہر کس و نا کس کی زبان پر ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اصلی اور صحیح معنی (مابعد الطبیعیات) میں اُردو کتنا چاہیے کہ ابھی فلسفہ کی ایجاد سے بھی نا آشنا ہے۔ اور کسی جلیل القدر مذہب فلسفہ کے بانی کا کوئی امکمل کلام کل کارنامہ تو قطعاً ہماری زبان میں موجود نہیں۔ اس لحاظ سے مبادی علم انسانی (جو پچھلے سال "دار المصنفین" سے شائع ہو چکی ہے) اُردو میں فلسفہ جدیدہ کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ یہ اگرچہ کینیٹ اور میگل وغیرہ کے سنگلاخ مصنفات کے دیکھتے ہوئے پانی بہتا ہوا ہے، تاہم چونکہ مباحث فلسفہ میں مابعد الطبیعیات کی بحثیں قدر تا زیادہ غیر الفہم مجرد اور پیچیدہ ہوتی ہیں۔ اس لیے تعلیم فلسفہ کے دائرہ اور اعلیٰ درجہ کا ہون کے احاطہ سے باہر بہت کم لوگ مبادی سے پوری طرح متمتع ہو سکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ایسی کتابیں زیادہ تر درس و تدریس ہی کے کام آ سکتی ہیں۔ چنانچہ یہ خود اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب فلسفہ میں داخل رہی اور رہتی ہے۔

ان افکار عالیہ کی اشاعت کو وسیع تر بنانے کے لیے اگر کوئی صورت ہو تو صرف یہ کہ ان کو تاہم امکان سہل اور صاف پیرایہ میں ڈھال کر مصنف کے دلچسپ احوال زندگی

وغیرہ کی لپیٹ میں بیان کر دیا جائے جس سے تلخ کامی کا احساس نسبتاً کم ہو جاتا ہے۔ اگر مریخی میں "بلیٹ وڈس فلو سا فکل کلاسکس" وغیرہ مختلف سلسلوں سے بہت کچھ ایسی مقصد کی خدمت گذاری ہوتی ہے۔ پیشکش مجموعہ کی بھی ایک بڑی غرض یہی ہے۔ اس میں (۱) برکے کی سوانح (۲) اس کی فلسفیانہ تصانیف کا مٹھن۔ اور (۳) اس کا فلسفہ تصویریت شامل ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی نسبت چند باتیں کہنی ہیں۔

سوانح | "شبلی اکا ٹومی" کے سید الطائفہ کا اعتراض ہے کہ "تم نے سوانح سے اتنے صفحات کیون رنگ ڈالے؟ ہکوبرکے کے خیالات سے مطلب ہے، اس کے حالات سے کیا شکر کا؟" مسٹر مین (پرنسپل دکن کالج) سے ایک روز گفتگو آئی تو کہا، کہ "برکے کی زندگی تو نہایت دلکش ہے لیکن اس کا فلسفہ سراسر بے معنی ہے" ہمارے نزدیک سائنس "یار ما این دا بدو آن نیر، ہم" برکے کی سب سے پہلے قابل استناد دلائل اسکی وفات سے ۲۳-۲۴ سال بعد لکھے گئے ہیں اسٹاک نامی ایک بشپ نے لکھی۔ جو نہایت مختصر اور ناتمام ہے لیکن سو برس تک کہنا چاہیے کہ اُسی کے چند واقعات کا الٹ پھیر کر، یورپ بھر میں اعادہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد پروفیسر فریڈر نے جا کر اس بے اعتنائی کے ننگ کو دھویا، جو اٹھارہویں صدی کے ایک فیلسوف اعظم کے حالات زندگی کے ساتھ برقی جا رہی تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ اس نے حق ادا کر دیا۔ تقریباً سو سال کے امتدادِ ایام کی دست برد سے جو کچھ بچا تھا، اس کے ایک ایک ذرہ کو انتہائی کاوش و تحقیق سے یکجا کر کے لکھنے والے "سوانح و مکاتیب برکے" کے نام سے ساڑھے پانچ سو سے زائد صفحات

۱۵۰۰ کے نزدیک فریڈر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۷ء) کا خود فلسفہ کے متنازعہ جال میں شمار ہونے والے مشہور استاد و پروفیسر گٹلن کے بعد ڈاکٹر یونیورسٹی "مین منطق و ما بعد الطبیعیات کے پروفیسر کی حیثیت سے اس کا جانشین قرار پایا برکے کا توڑ پورا پورا تسلیم ہی ہے۔ باقی لاکھ وغیرہ بھی اسکے قلم کے منت کش ہیں۔ خود اپنی لائف نہایت دلچسپ لکھی ہے۔

کے ضخیم جلد میں شائع کیا۔ اسی کے ساتھ تین جلدوں میں تمام نوشتجات بھی نہایت سلیقہ سے تین عنوانات کے تحت میں مرتب کر کے چھاپ دیے۔ ”سوانح و کاتیب“ دالی جلد میں برکلی کی چند پرائیویٹ غیر مطبوعہ تحریریں بھی شامل ہیں جو سوانح نگار کے لیے نہایت قیمتی مواد ہیں۔

تھوڑے دن بعد کچھ اور ذخیرہ ہاتھ آیا۔ جس میں سر جان پرسپول کے نام کے خطوط خاص بہت رکھتے ہیں۔ اس جدید سرمایہ معلومات کو سامنے رکھ کر اسے عین پھر قریباً ڈھائی سو صفحے کی ایک کتاب برکلی پر لکھ ڈالی جس میں پرسپول کی مراسلتہ کے اقتباسات جا بجا درج ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں مجموعہ نوشتجات ”کاتیب و سوانح“ کا دوسرا ایڈیشن بہت کچھ اضافہ کے ساتھ نکلا۔ اور اب جو کچھ برکلی کے کوائف حیات سے متعلق لکھا جاتا ہے وہ تا ستر فروری کے خرمین کی خوشہ چینیان ہوتی ہیں۔

اس بنا پر اسے بعد برکلی کا کوئی سوانح نگار اگر فروری کے سوا کسی اور کا نام لے تو یہ قطعاً اس کی حق ناشناسی یا پھر اپنی وسیع انظری کا خواہ مخواہ دکھلاوا ہوگا۔ ورنہ انصاف یہ ہے کہ ایک قطرہ بھی اس سمندر سے باہر نہیں ہے ہنسنے جو کچھ کیا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ۶۰۰ صفحات کو ۵۰ صفحے میں بچوڑ لیا ہے تفصیل سے اجمال پر قناعت کی۔ اُن باتوں کو کلیتہً چھوڑ دیا ہے جو برکلی سے بالذات یا قریبی علاقہ نہیں رکھتیں۔ کاتیب کے صرف باطل اور جستہ جستہ اقتباسات پر بس کیا ہے پھر بھی اس امر کا پورا اہتمام رکھا گیا ہے کہ کوئی ایسا جزئی سے جزئی واقفہ بھی نہ چھوٹے پائے جس زندگی کے کسی رُخ پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہو۔ اس کی خاطر بعض غیر محسوس اور مُعل باتیں بھی آگئی ہیں لیکن جو خط و خال بھی چہرہ پر دکھلائی پڑے ہیں۔ اُن کو اتنا اجاگر کر دیا گیا ہے کہ مفرد رجحان مل نکتہ سامنے آجائے چونکہ ہم نے تمام مواد خود پڑھ کر براہِ راست استعمال کیا ہے اس لیے قدرتی طور پر اخذ و استنباط میں کمین کمین پر و فیسر موصوف سے اختلاف ہو گیا ہے۔ واقعات کی ترتیب و تزیین میں بہت کافی فرق ہے جو لوگ فلسفہ سے ذہق بھی نہیں رکھتے اُمید ہے کہ اُن کے

یہ سوانح کا حصہ کچھ نہ کچھ دلچسپ اور بہت کچھ سبق آموز ہوگا۔

ہمارے سید فاضل، جو سوانح کو سرے سے غیر ضروری یا وہ صفحے سے زائد اسکی نذر کر دینا بجا خیال فرماتے تھے، انکی اتنی نظر تو لگ ہی گئی کہ کاتب صاحب نے پورا ایک ٹلٹ مسودہ غائب کر دیا۔ گم شدہ مسودہ کو از سر نو دوبارہ لکھنا جس درجہ ناگوار اور تلخ تجربہ ہے اس کا حال اس تلخ کامی کے کسی تجربہ کار ہی سے پوچھو۔ طبیعت پر ہیچ جبر کر کے بُری بھلی طرح اس بوجھ کو اتارنا پڑا جس کا فقط اتنا ہی وبال نہیں پڑا کہ دو چار صفحے اور گھٹ گئے، بلکہ واقعات کے ایک گونہ باہمی عدم تناسب اور ناہمواری وغیرہ کے بھی بعض نقائص پیدا ہو گئے،

تصنیفات | اس عنوان میں صرف وہی کتابیں لی گئی ہیں جنکو کچھ نہ کچھ فلسفیانہ افکار و مباحث سے تعلق ہے۔ اور کسی قدر ناقدرانہ حیثیت سے اُن کے مہاتر مطالب کی تلخیص کر دی گئی ہیں۔ جدید نظریہ رویت کا مرقع تفصیل سے ذکر ہے کہ وہ بجائے خود علم النفس و علم المرایا کے ایک عظیم الشان التکشاف و تحقیق پر مشتمل ہونے کے علاوہ مبادی کے اصل فلسفہ کا مقدمہ اولیٰ یا صغریٰ ہے۔ خود مبادی علم انسانی کے دعویٰ کو بھی اختصار کی رعایت کے ساتھ جہاں تک بن پڑا ہے زیادہ واضح اور سہل تر اسلوب سے بیان کر دیا گیا ہے کہ عام آدمی بھی ٹھوڑا بہت بہرہ اندوز ہو سکے۔

پروفیسر فریئر نے اس میدان میں بھی اپنی قابلیت اور محنت کی داد دی ہے یعنی ہر تصنیف پر ایک بسیط اور مفید دیباچہ لکھا ہے۔ مباحث کتاب کا خلاصہ بھی دیدیا ہے لیکن اس بارے میں ہم برائے نام ہی کسی دوسرے کے رہیں ہیں کیونکہ ہم نے خود ہر کلمے کے مصنفات کا کہنا چاہیے کہ ایک ایک حرف پڑھا ہے۔

فلسفہ تصویریت | کتاب کا یہ حصہ ارباب ذوق کی نظر اور غائر نظر کا سب سے زیادہ مستحق ہرابتدائیں

فلسفہ برکلی کی مخصوص نوعیت اور اسکے ارتقائے تاریخی کی چند موٹی موٹی کڑیوں کا ذکر ہے
پھر تشریح و تنقید ہے۔

اس ذیل میں صرف اتنی بات قابلِ لحاظ ہے کہ برکلی کے اصل نظریہ اور دعوے
کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن اس کے دلائل کا کلیۃً التزام نہیں کیا گیا ہے بلکہ اختصار
کی خصوصیت کے ساتھ زیادہ ذہن نشین ترتیب مقدمات اور زیادہ سیر الفہم پر ایہ بیان
میں تشریح کی کوشش کی گئی ہے۔ تنقید میں وجودِ خدا کے دلائل کی جو کچھ تضعیف کی گئی
ہے اُس سے فلسفہ التصورات کی کمزوریوں کا اظہار مقصود ہے۔

اخیر میں مجھ کو اپنے فاضل اور مکرم دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر ایم۔ اے فیلو
سوفی یونیورسٹی کا بالتخصیص شکریہ ادا کرنا ہے۔ انکی بدولت نہ صرف ممبئی کے کتب خانوں
سے بہ وقت ضرورت متع اُٹھاتا رہا ہوں۔ بلکہ برکلی اور مبادی علم انسانی دونوں پر
نظر ثانی انہی کے علم کہہ پر ہوئی ہے۔ بعض وقت حوالوں کی جستجو میں اُنھوں نے مدد
دی ہے۔ جابجا انگریزی شکوک میں اُن سے تشفی حاصل کی گئی ہے۔ اپنے مرتبہ سے
اُتر کر اُنھوں نے تصحیح تک کی خدمت انجام دی ہے۔

کتابت کی غلطیاں کماؤ کیفاً کسی حیثیت سے بھی مبادی سے کم نہیں ہیں بعض جگہ
اقتباسات کے ترجمہ میں انگریزی لفظ کا انگریزی ہی خط میں نہایت برنما پور نظر آئے گا۔ خدا
جانے یہ کتاب کی ہر بانی ہے یا مسودہ میں نظر ثانی کے وقت کاٹنا رہ گیا۔ کچھ بھی ہو دوسرے
ہی تجربہ کے بعد یہ تہیہ کر لینا پڑا ہے کہ جب تک کاٹ چھانٹ کے بعد مسودہ خوشخط اور جلی
قلم سے صاف نہ کر لیا جائے، اس وقت تک پریس کے حوالہ نہ کرنا چاہیے۔

عبدالباری

(دکن کالج پونہ۔ جنوری ۱۹۱۹ء)



سوانح

بہتید آج جب ہم ہندوستان کو برکے سے روشناس کر رہے ہیں، تو یہ اپنے حالات اور تاریخی نوعیت کے لحاظ سے بہت کچھ اُس دور کے یورپ سے ملتا جلتا ہے، جب برکے ہستی میں قدم رکھنے والا تھا، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے، کہ بیسویں صدی کے ہندوستان کی طرح سترہویں صدی کا یورپ زندگی کے تمام جوانب اور شعبوں میں اصلاح و تجدید کے لیے بیکل تھا۔ وہ مذہب، سیاست، تمدن اور علوم کے لباس کہن کے ایک ایک تار کو اپنے جسم سے جدا کر رہا تھا۔ پروٹسٹنٹ تحریک نے کیتھولک عقائد و اعمال سے عام بڑی پیدا کر دی تھی۔ پوپ کا تخت تسلط الٹا جا چکا تھا، جمہوریت پسندی پھیل رہی تھی، ایوان شخصیت کے ارکان متزلزل ہو چکے تھے، بری یورپ کی سسی سالہ جنگ (۱۸۷۱ء) اور انگلستان کی خانہ جنگی (۱۸۶۱ء) مذہب و سیاست ہی کے اصلاحی مطالبات و مناقشات کے خونین مظاہر ہیں۔ علوم کا بھی یہی حال تھا۔ حکمت (سائنس) کی متعدد نئی شاخیں پیدا ہو چکی تھیں، حکمیات قدیمہ کے بہترے مسائل و نظریات میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ ہیئت کے انکشافات نے آفتاب کی جگہ زمین کو متحرک کر دیا تھا۔ کشتِ نقل کا عالمگیر قانون، جو تاریخِ حکمت کا سب سے عظیم انسان انکشاف یقین کیا جاتا ہے، اسی صدی میں محقق ہو چکا تھا، برقی اور مفاطیسی تحقیقات سے عنقریب عالم جگمگا

ٹھٹھنے والا تھا۔

انقلاب انگیزی کی اس مہم گیر آمد ہی سے فلسفہ یا الکبات کی خضاکین کو غیر متاثر یا مستثنیٰ رہ سکتی تھی، چنانچہ اتنا شدید جو بچال آیا کہ جس شاہ راہ پر طالعلس ملطی سے لیکر اسطو، اسطر سے لیکر ڈیکارٹ اور ڈیکارٹ سے لیکر لاک تک چلتے آئے تھے۔ وہ دفعۃً پانون کے تے سے نکل گئی۔ تاریخ فلسفہ کے اسی انقلاب اعظم کا علم بردار ہمارا امیر وہ ہے۔ انسان کی زندگی کے قدرتی طور پر تین حصے ہیں۔ لڑکپن یعنی نشوونما اور تحصیل الکتاب۔ کاسن جس میں دوسرے حصے کے لیے آدمی اپنے کو تیار و مستعد بناتا ہے۔ پھر جوانی، جو جہد و عمل کا عہد ہے۔ اور سب سے آخر بڑھاپا، جس کو انحطاط و عزالت کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ ہم برکلے کی حیات و حالات کو انہی تین قدرتی ابواب میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ لڑکپن

۱۶۸۵ء تا ۱۷۰۷ء

جو لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں، کہ بچہ پر اسکی خاندانی روایات ماحول اور سوسائٹی کے حالات و اطوار کا کیا اثر پڑتا ہے، اور یہ کہ اس کے مستقبل کے کارناموں کے اصلی اسباب و علل کی جستجو ہمیں کرنی چاہیے۔ ان کو یہ معلوم کر کے نہایت افسوس ہوگا، کہ برکلے کی زندگی کے اس پہلے ورق پر چند لکیروں سے زیادہ کچھ نہیں نظر آتا۔ اور اسکی عمر کے ابتدائی پندرہ سال بالکل تاریکی میں مین انقیاس و استنباط کی روشنی میں ان لکیروں سے جو کچھ پڑھا جاسکتا ہے وہ پیشکش ہے۔

نام و نسب: بوراتام جارج برکلے ہے۔ آئرلینڈ کے پائے تخت ملبن سے تقریباً ۷۵ میل کے فاصلہ پر شہر ٹامس ٹاؤن کے پاس ڈائمرٹ کیسل نامی ایک چھوٹی سی آبادی میں

۱۲ مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوا۔ باپ کا نام ولیم برکلی ہے۔ برکلی ایک نہایت وسیع خاندان کا نام ہے، جس میں ارل برکلی، سر برکلی، لارڈ برکلی وغیرہ خطابات نظر آتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خاندان بہت ہی بارسوخ اور عزت تھا، ولیم کا باپ غالباً جس وسیلے سے اپنا آبائی وطن انگلستان چھوڑ کر آئرلینڈ میں آ بسا، وہ یہ تھا کہ شش ماہ میں اسی خاندان کا ایک رکن لارڈ برکلی آف اسٹرٹن آئرلینڈ کا لارڈ لوفٹنٹ یا ڈائریکٹر ہو کر وہاں گیا، ممکن ہے کہ ولیم لارڈ برکلی کا کوئی قریبی عزیز رہا ہو۔ لیکن بذات خود یہ معمولی حیثیت اور ادا کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ علم نے اپنے فرزند کی تربیت کے لیے اکثر افلاس و بے نوائی ہی کی آغوش کو پسند کیا ہے، انسا کیلویڈ یا برنیا میں لکھا ہے کہ یہ چنگی ہیں ملازم تھا۔ بعد کو کچھ دن فوج میں بھی رہا۔ برکلی اپنے باپ کی سب سے بڑی اولاد ہے۔ پانچ بھائی اور ایک بہن اور تھی۔

برکلی کو آئرش فلسفی کنارڈسٹ نہیں | برکلی علی العموم آئرش فلسفی کہا جاتا ہے لیکن یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کسی نو وارد انگریز کا جو لڑکا یہاں پیدا ہوا، اس کو تم ہندوستانی کہہ دو، کیونکہ ولیم خود انگلستان نژاد تھا، اور برکلی کی پیدائش سے کل پندرہ سال پہلے نقل وطن کرے آئرلینڈ چلا آیا چنانچہ مستفسرین ایک مقام پر اشارتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود برکلی اپنے آئرش انگلش میں سمجھتا ہے،

کلکینی کا اسکول | دس برس کی عمر تک یہ مطلق نہیں معلوم کہ برکلی کس حال میں رہا کیونکہ کس سے پڑھا۔ لیکن ۱۹۱۷ء میں جب یہ کلکینی کے اسکول میں داخل ہوا ہے تو اس کا نام سکینڈ کلاس میں لکھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں سب سے نیچا کلاس یا پنچوان تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برکلی کی ایک کتاب کا نام ہے جس کا ذکر آگے آئے گا اس میں آٹھ مارچ ۱۹۱۷ء دیکھو فروری ۱۹۱۷ء

ہوتا ہے، کہ گھر پر اس کی تعلیم و تربیت کے ساتھ بے اعتنائی کا سلوک نہیں کیا گیا تھا طبیعت میں ایچ کم سنی ہی سے موجود تھی، ہر بات کو معمولی لڑکوں کی طرح آسانی سے نہ قبول کرتا ہوگا، نہ محض سنی سنائی باتوں کو بے جا گتا ہوگا۔ چنانچہ خود تعلیمات میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں آٹھ ہی برس کے سن سے بے بے اعتمادی و انکس تھا، اور اس لیے کہنا چاہیے کہ بالطبع، ان جدید خیالات کی جانب رجحان میلان کا مادہ موجود تھا، مزاج میں اسی قسم کا شک یا بے اعتمادی اجتہاد اور حریت فکری کا سنگِ اساس ہے، اس لیے مختل و داغ رکھنے والوں میں بچپن ہی سے اس کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔

کلکٹی، برکلی کے مستطالہ اس سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا پرنسپل اور خوش منظر شہر ہے، ۱۹۶۷ء میں جب یہاں کے اسکول میں داخل ہوا، تو اسی سال ٹاس پر لڑنا، کبھی ایک لڑکا داخل ہوا جس کے ساتھ غالباً نہایت دوستی اور محبت کے تعلقات، اسی اسکول کی زندگی میں پیدا ہو گئے ہونگے، جو مرنے دم تک قائم رہے۔ یہاں ولیم کے ہونا، نوہال نے تقریباً ۴ سال بسر کیے، لیکن کیونکر اور کس طرح؟ یہ ہم کو بالکل نہیں معلوم۔ یہ ایک تصریح کے ساتھ نہیں ملتا کہ اُس نے اس اسکول میں کیا پڑھا، فریزر نے قیاس سے یہ لکھ دیا ہے کہ لاطینی کی کتاب سمجھنے لگا ہوگا، اور شاید کچھ آسان کتابیں یونانی کی بھی پڑھ لیتا ہو۔ ریاضی سے بھی بالکل بیگانہ نہ رہا ہوگا۔

غارڈنور [فریزر نے ایک عجیب تناقض بیانی کی ہے کلکٹی سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر غارڈنور کے نام سے کسی ہاڑسی میں ایک نہایت تجسس انگیز اور حیرت افزا خاندن پرکلی کی تجسس طبیعت اس کو بغیر دیکھے کیونکر مان سکتی تھی۔ اس نے اُس کو اچھی طرح دیکھا، اور برس کے ۱۷ء پر برکلی کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ اُس کا بھی ذکر آگے آتا ہے۔

بعد محض یاد سے اس کا مفصل بیان قلم بند کیا۔ جو فریزر نے سوانح و کتابت کے ساتھ
چھاپ دیا ہے۔ اور فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ ”اسکی تاریخ تحریر نہیں دی ہوئی ہے، کالج
کی زندگی میں کسی تعطیل میں برکے نے اُسکو دیکھا ہوگا، مگر شروع میں جہاں کلکنی کے حالات
لکھ رہا ہے، لکھ دیا ہے، کہ غالباً اُسی زمانہ کے ابر بھیڑ میں برکے نے غار و نور کی سیر کی ہوگی
لیکن خود برکے کا بیان غور سے پڑھنے کے بعد بہ امر قریباً پوری طرح صاف ہو جاتا ہے کہ
۱۸۷۱ء سے پہلے اس نے اُسکو حوالہ قلم نہیں کیا ہے، کیونکہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ”کون جانتا ہے
کہ پُرانے زمانہ میں امریکن ڈولے اس غار سے وہی کام لیتے ہوں جو روم اور نیپلس کے
مصنوعی غاروں سے وہاں کے قدیم باشندے لیتے تھے“ نیپلس وغیرہ کی سیاحت اُس نے
۱۸۷۱ء میں کی ہے۔ اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ان مصنوعی غاروں کو دیکھ کر اور ایک
خریج کتاب میں کسی اور غار کا حال پڑھ کر جسکو یہ ڈنور کے غار سے بہت مشابہ بتلاتا ہے
دفعۃً اُس کا ذہن سات سال پیشتر کے دیکھے ہوئے غار و نور کی جانب منتقل ہوا ہو اور
قدرتاً اس کو قلم بند کرنے کا جی چاہا ہوگا۔ لہذا اگر ہمارے قیاس صحیح ہے تو کلکنی کے ۱۸۷۱ء
سال کے کم سن اسکولی بچے نے اس ہیبت ناک غار کے دیکھنے کی ہمت نہیں کی، بلکہ
۱۸۹۰ء میں ۲۵ سال کے سن میں ٹرنٹی کالج کے ایم اے اور ڈوئین برکے نے اس کا
مشاہدہ کیا۔

بہر کیف خواہ برکے نے ڈنور کے اس عجیب و غریب غار کو اسکول یا کالج کے عہد
طالب علمی میں دیکھا ہو یا اس کے بعد لیکن اس سے اسکی غیر معمولی خواہش تحقیق و تفحص کا
قطعی پتہ چلتا ہے، جو حالات اُس نے لکھے ہیں وہ اس بات کی کافی شہادت ہیں کہ ہر
معمولی ہمت و حوصلہ کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے، چنانچہ کچھ ساہتی مارے خوت کے

اتنے بے صبر ہو گئے کہ ٹھوڑی ہی دور تک اس کا ساتھ دیکر تھک آئے، لیکن اُس نے وہ سب کچھ دیکھا، جس کے بعد لکھتا ہوا کہ اگرچہ زمانہ کے فصل نے جو جو کچھ مین نے یہاں دیکھا تھا اُن مین سے بہت سی چیزوں کے صرف دُھندلے اور ناتمام نقش ذہن مین باقی رہنے دیتے ہیں، لیکن اس عظیم اور عمیق نقل غار کی دہشت خیر سنسانی، ہیبت ناک تاریکی، اور بھیاںک سناتے نے، میرے حافظہ پر ایسے اثرات چھوڑے ہیں جو کبھی محو نہیں ہو سکتے، آگے چلکر اس کے اندر ایک چشمہ کے متعلق لکھتا ہوں لیکن جو چیز سب سے زیادہ حیرت مین ڈالتی ہو وہ یہ ہے کہ اس چشمہ کی تہ مردوں کی ہڈیوں سے بھری پڑی ہے، یہ سارا بیان نہایت دلچسپ ہے، لیکن خوف طوالت سے ہم صرف اس مختصر اقتباس پر قفا کرتے ہیں۔

ٹرنٹی کا کالج ڈبلن | ابھی سترھویں صدی کے اختتام مین کچھ مینے باقی تھے کہ ہمارے فارغ التحصیل کے مکشف نے اپنی تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کر کے کلکینی سے ڈبلن کا رخ کیا، یہاں پہنچتے ہی میٹرکولیشن پاس کر کے ٹرنٹی کا کالج مین اعلیٰ تعلیم پر متوجہ ہوا۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ یورپ کی یونیورسٹیاں ارسطو کی غلامی سے رہائی حاصل کر چکی ہیں۔ مدرسیت کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ گلیلو، ڈیکارٹ، نیوٹن، لاک وغیرہ کے اکتشافات و تحقیقات سرعت و قبول کے ساتھ گھر گھر پھیلنے جاتے ہیں۔ خود ڈبلن کی یونیورسٹی مین جو قدامت پرستی کے لیے بدنام ہے، کہنا چاہیے کہ قدیم وجد و افکار کی معرکہ آرا یون کا آخری دنگل تھا، مشائیت اور مدرسیت شکست کھا کر کھاڑے سے نکل رہی تھی۔ ڈیکارٹ میلے براں کا، رابنسنز وغیرہ کے نظریات ابھی طرح متعارف ہو چکے ہیں، لاک کی کتاب فہم انسانی پر نہایت گراں گیر بحثیں ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی اور اسکی دیوانوں سے باہر ایک سے

نارادر اب کمال موجود تھے۔ ڈاکٹر پیٹر براؤن جو فلسفہ کا نہایت متاثر عالم تھا، اور لاک کے حریف نقاد خیال کیا جاتا تھا، ٹرنٹی کالج کا ناظم تھا، اور ڈاکٹر جان ہل جس نے برکے کے دل میں ریاضی کا شوق پیدا کیا، نائب ناظم کی خدمت پر فائز تھا، سسٹم میں ولیم کنگ ڈبلن کا آرچ بشپ ہو کر آیا۔ یہ اپنے زمانہ کا نہایت مشہور علم تھا خیال کیا جاتا ہے کہ اسکی شخصیت کا برکے پر کافی اثر پڑا ہو گا۔ چنانچہ بعد کی تحریروں میں ایک دوسرے کے بعض کلامی مسائل کے حوالے بھی ملتے ہیں۔

غرض قدیم و جدید خیالات کی کشمکش اور ان اہل علم کی کجانی نے برکے کے ذہن کے ساتھ سونے میں نہاگے کا کام کیا ہو گا، لیکن جیسا کہ تم کو اوپر معلوم ہو چکا ہے، برکے ازل سے برگمان اور کاوش پسند دماغ لے کر آیا تھا، اس لیے یہ ناممکن تھا، کہ ارسطو اور مدرسین کی عبودیت کے طوق کو اتار کر نیوٹن اور لاک کے غاشیہ برداروں میں شامل ہو جاتا، اس کے نزدیک اگر مشائیہ اور مدرسیہ کا فلسفہ حکمت سر تا سر لفظوں کا کھیل تھا، تو نشاۃ جدیدہ، اور اُس کے معاصر فلاسفہ اور حکما کے اصول و نظریات بھی ان خامیوں سے پاک نہ تھے اس لیے اُس نے اپنا علم نصب کرنے کے لیے سب سے الگ میدان تلاش کیا۔

افسوس ہے کہ اسکی کالج کی تعلیم زندگی کے صفحہ پر بھی واقعات کی چند خشک تاریخوں کے سوار دیتا اور کچھ نہیں نظر آیا۔ آرچ بشپ گلگنی کے اسکول سے ٹرنٹی کالج آیا۔ میٹرک و لیشن پاس کیا۔ سسٹم میں اسکا رشپ حاصل کیا۔ سسٹم میں بی اے ہوا۔ سسٹم میں ایم اے اور اسی سال جون میں فیلو منتخب ہوا۔ یہ ہے سات سال سے لے کر مزید تفصیل کے لیے خود فریئر و دیگر سوانح و مکاتیب۔

زائد مدت کے واقعات کی کل کائنات، جو اٹھارھویں صدی کے فیلسوفِ اکبر کے سوانح نگاروں نے ہمارے لیے سیا کیا ہے، جس سے تشنہ کاموں کے لب بھی نہیں تر ہو سکتے۔

ہم کو یہ مطلق نہیں معلوم، کہ وہ اپنی یوسہ زندگی کے ۲۴ گھنٹے کن کن شاعلمین صرف کرنا تھا۔ کس قسم کے لوگوں سے زیادہ ملتا جلتا تھا۔ عام عادات و اخلاق کیا تھے، اساتذہ اور محبتوں میں کس نظر سے دیکھا جاتا تھا، اسکول کا ساتھی ٹاس پر لڑ بھی کالج ہی میں تھا، غالباً کچھ ہی آگے پیچھے آیا ہوگا۔ اور آئندہ کے تعلقات سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ تو فلسفی کا یہی سب سے بڑا منس اور بے تکلف دوست رہا ہوگا۔ مسئلہ کے اسکا لرشپ سے معلوم ہوتا ہے کہ خارجی مطالعہ کے ساتھ کالج کے کام و امتحانات میں بھی اپنے ساتھیوں پر سبقت و امتیاز رکھتا تھا۔

پھانسی کی آزمائش | اسی زمانہ کا ایک نہایت عجیب قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو بہ ظاہر نہ صرف مستبعد بلکہ ایک طرح کی جنون کا رمی نظر آتی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے، کہ علم و تحقیق کے دیوانوں سے کچھ بھی دور نہیں۔ خصوصاً غارِ دمنور کے مندرجہ تحت کی فطرت کے تو بالکل مطابق ہے۔ حال قصہ یہ ہے کہ پھانسی کی سزا دیکھنے کا اشتیاق اس کو ایک دن سیانگاہ لے گیا، اس بے بسی کی مجرمانہ موت کے نظارہ کا، اُس پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ نہایت دل گرفتہ اور فکر مند لوٹا۔ ساتھ ہی یہ خیال ہوا، کہ خود آزمائش کر کے دیکھنا چاہیے کہ کیا احساس پیدا ہوتا ہے۔ کوئی نامی اپنے ایک بے تکلف دوست سے صلح کی کہ آؤ ہم دونوں تجربہ کریں۔ اور ایک اشارہ مفر کر لیا کہ جس وقت وہ کیا جائے فوراً بند کھول دینا چاہیے، ہمارے انڈر گریجویٹ اسکالر نے پہل کی، چنانچہ کوٹری نے اُسکو چھت میں باندھ دیا اور نیچے سے کرسی ہٹالی، نتیجہ یہ ہوا کہ اشارہ کا انتظار کیا جاتا تو چند لمحوں میں تجربہ کے شہدائی کی روح پرواز کر جاتی۔ کوٹری نے

پھرتی سے گرہ کھول دی اور یہ بے حس و حرکت زمین پر گر پڑا۔ دیر کے بعد ہوش آیا اب بھلا
کو نظر تیری کی کیا بساط تھی کہ وہ اپنے اوپر اس آزمائش کی ہمت کرتا۔

غالباً اسی طرح کے اور واقعات اس سے ظاہر ہوتے رہتے ہونگے۔ اور انھیں کا
یہ نتیجہ ہو گا، کہ کالج میں بعض لوگ تو اسکو عقل مبہم اور نہایت غیر معمولی انسان خیال کرتے
تھے، اور بہت سے لوگ محض باگل۔ یہاں تک کہ جب کبھی یہ فکر و مطالعہ کے زاویہ سے
باہر نکلتا تھا تو بعض شریر لڑکے اُس کو گھیر لیتے تھے، اور بہت بناتے اور دق کرتے تھے،
اس نے ایک آٹھ بار شکایت بھی کی لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ بلکہ جتنا یہ بھاگتا، اور نیر ہوتا تھا،
اتنا ہی وہ اور چھیڑتے تھے، اور یہ ذرا بھی تعجب انگیز نہیں کیونکہ جن لوگوں سے سوسائٹی میں
عام روش کے خلاف کچھ بھی بیگانہ اور غیر معمولی عادات و اخلاق ظاہر ہوتے ہیں اور جو بھی
جماعت کی بھڑون سے الگ چلنا چاہتے ہیں اُن کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہو، لیکن
یہ سنگ اندازی ان علم کے مجنون کو اُس کے جوش و انہماک سے نہیں باز رکھ سکتی تھیں۔ وہ
برابر اُسی دھن میں لگا تھا۔

کتاب تعلیقات | سات سال کے خارجی حالات زندگی میں مذکورہ بالا اعداد و اوقات کے علاوہ
بس یہ ایک قصہ ہم کو اور معلوم تھا۔ لیکن اپنے ذہنی واردات زندگی کی برکت نے کہنا چاہیے
کہ خود نوشتہ سوانح عمری ہمارے لیے چھوڑی ہو جس سے نہ صرف اس کے خارجی احوال
نگاروں کی بے اعتنائی اور غفلت شعاری کی اشک ثنوی ہو جاتی ہو بلکہ اس کی کا وہ
نغمہ البدل ہو۔ کیونکہ برکت کی عظمت کا اصلی راز اُس کی حیات ذہنی ہی ہو۔

شاید کہ درین سیکھ با دریاہیم آن یار کہ در صومعہ ہا گم کردیم
یہ ذہنی سوانح ایک طرح کی یادداشتوں کا مجموعہ ہر جن کا نام ہم تعلیقات کہتے ہیں

انکی ضخامت تقریباً ۹۰ صفحے ہیں ان میں اُس نے ایک جگہ لاک کی موت کا ذکر کیا ہے جو
سلسلہ میں واقع ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گریجویٹ ہونے سے پہلے ہی ان
یادداشتوں کو اُس نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور پھر غالباً سہ مبادی کی تصنیف تک
ان کا سلسلہ جاری رہا، ان تعلیقات کا مطالعہ متعدد حیثیات سے نہایت دلچسپ ہے
خصوصاً ان لوگوں کے لیے جن کو فکری اور تصنیفی زندگی کا کچھ ذوق حاصل ہے۔

اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، یا کسی کتاب کے پڑھتے وقت جو خیالات کسی مسئلہ کی
نسبت ذہن میں خطور کرتے ہوں گے وہ بلا کسی خاص ترتیب کے اس کتاب یا دداشت
میں مجتمع ہیں۔ زیادہ تر ان کا تعلق علوم فلسفہ کے مسائل سے ہے، مثلاً روح، زمان
مکان، خدا، مادہ اسکے صفات، وجود وغیرہ، ریاضیات و علم المرایا اور
کہیں کہیں فلسفہ طبعی کے مباحث سے متعلق بھی اشارات ہیں کلام و اخلاقیات
پر بھی کافی ذخیرہ ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ سارا مجموعہ دیگرین ہے جس کے ذریعہ سے
سلسلہ میں ہمارا نوجوان فلسفی مادیت کے اُن استحکامات کو زمین دوز کر دینا چاہتا تھا
جبکہ طرٹ ڈھانی ہزار سال کی مدت میں فلسفہ وحکمت کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت نے
بھی نظر اٹھائے دیکھنے کی جرات نہ کی تھی، یعنی مرکزی حیثیت سے یہ تمام تعلیقات نظریہ
رویت اور مبادی علم انسانی کا مواد و مصالح ہیں، چنانچہ جا بجا یہ لکھا ہوا ملتا ہے
کہ فلان خیال کو کتاب کے فلان حصہ میں رکھنا یا استعمال کرنا چاہیے، بہت سے ایسے
جلے اور عبارتیں ملتی ہیں جو بعینہ مبادی میں منقول ہیں۔

دور جدید اور اپنے عصر کے تمام حکما اور فلاسفہ سے ابھی طرح واقف نظر آتا ہے۔

لے ان دونوں کتابوں کا مفصل ذکر آگے آوے گا۔

مشاہیر علماء ریاضیات کے بہ کثرت نام ملتے ہیں مثلاً ^{پہلے} ڈیرنگ، ویس کوئرس، بلی
کیل وغیرہم۔ باقی ڈیکارٹ، نیوٹن اور ہائس کی تحقیقات کا تو پورا علم رکھتا ہے اور لاک کا تو
کہنا چاہیے کہ متعلم ہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکی کتاب فہم انسانی کو حرت حرت پڑھا
ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایک سے زائد بار پڑھا ہو۔ قدم قدم پر اس کا نام اقتباسات اور
حوالے آتے ہیں۔ اسپنوز اور سیلے براؤنکا سے بھی آشنا ہے، لیکن ان کی اس کے ذہن میں
کچھ خاص وقت نہیں معلوم ہوتی،

بالموم سوانح نگاروں نے یہ لکھ دیا ہے کہ مبادی، بلکہ مکالمات ہائس کے زمانہ
تصنیف تک برکے قدما، یعنی یونانیوں اور مدرسہ سے برے نام ہی واقف ہے، لیکن
بیان بہت زیادہ مبالغہ آمیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مکالمات السیفارن لکھتے وقت
(۲۹ تا ۳۲ء) اس کا مطالعہ اور اسکی نظر بہت زیادہ وسیع ہے، لیکن علاوہ اور قرائن
کے ان تعلیقات کے پڑھنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مبادی کا مصنف بھی یونانیوں اور
مدرسین سے خاصی واقفیت رکھتا ہے، ایک سے زائد جگہ ارسطو کا ذکر ہے، بیگانہ دار نہیں، بلکہ آشنا
کی طرح۔ اپیکورس اور اسکی بلند بانگ ادیت سے بھی خبر دار ہے، زینو کا اگرچہ نام نہیں
لیکن افکار حرکت کا تصریح کے ساتھ حوالہ ہے۔ حکیم ارسطیدس اور ارسٹیدس تک کا
علم رکھتا ہے اور مدرسہ سے اس کو قلیل الوقتی کتنا تو نہایت عجیب ہے، تم کو خود مبادی

۱۔ پہلے وہی مشہور عالم ہیئت و ریاضی ہے جسکے نام سے متعلقہ کادم دار شاہ مشکوہی ڈیرنگ ریاضیات کا
وہ جدید عالم ہے جس سے بلند پایہ پیمائشوں خیال کیا جاتا ہے، ۲۔ مین مراد کوئرس دہلی اٹلی اور فرانس
کے نامور علماء ریاضی ہیں، چنانچہ نیل کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے نیوٹن کے
اصول کی تعلیم دتا، تیسرا ہے مین مراد۔

۳۔ ارسٹیدس یونانی کا ہے، اس سے بڑا عالم ریاضیات، ہیئت وغیرہ کے متعدد آلات کا موجد تھا۔

ہی کے پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ مدرسیت کی حقیقت کو اس سے بہتر شاید ہی کسی نے سمجھا ہو، ان یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ ان ہوائی قلعہ بندوں کے ناموں کا حافظہ ہو۔ لیکن اس حقیقت سے کامل طور پر آگاہ ہے کہ ان کا فلسفہ لفظوں کا طلسم ہے، البتہ یہ امر موجب حیرت ہے کہ یونانیوں میں فلاطون اور سوفسطا یہ سے ابھی وہ بالکل لاعلم معلوم ہوتا ہے۔ انہی تعلیقات میں ایک علمی مجلس کے قیام کا دستور عمل بھی شامل ہے۔ یہ ہفتہ وار صحبت کہنا چاہیے کہ بالکل ہی کے جوش و تحریک کا نتیجہ تھی، جو جنوری شہین قائم ہوئی، اسکو ایک طرح کی پرا بویٹ صحبت سمجھنا چاہیے جس کے نمبر ۱۰۰ سے زیادہ نہ تھے اور یہ غالباً اسی کے ہم مذاق رفقاء کا چ رہے ہونگے، اس مجلس کا مقصد فلسفہ جدید کے بعض مسائل پر بحث و گفتگو تھا۔ مجلس کی اہمیت اور اس کے بانیوں کی رفعت ذہنی اور علمی کا اسکی اس ایک دفعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب مجلس کے مقررہ موضوع پر اچھی طرح سے گفتگو ہوئے، تو پھر ممبروں کو اختیار ہے کہ کسی اور شعبہ حکت سے متعلق اپنے مخصوص اجتہادات نئے افکار یا ملاحظات مجلس کے روبرو پیش کریں، اس صحبت میں بھی غالباً لاکھ ہی کے نظریات سب سے زیادہ زیر بحث رہتے ہوں گے۔

اب ہم تعلیقات، کے ایک اقتباس پر اس دور زندگی کو ختم کرتے ہیں جو ہکو شروع ہی میں پانچویں یا چھٹے صفحہ پر ملتا ہے اور جو ہمارے مجتہد اعظم کی فکری زندگی کا دستور عمل (ماٹو) ہے، اور جس کے بغیر کسی شخص کو بھی اختراع و اجتہاد کا شرف نہیں حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی فطرت کا ارتقاء ہے جس کے آثار ہمارے ٹرنیٹی کلج کے فیلو کو اپنے اندر آٹھ ہی سال کے سن سے نظر آتے تھے اور جبکہ وہ اپنے مزاج کی بے اعتمادی یا شکی بن سے تعبیر کرتا ہے۔ ساتھی وہ پہلے ہی سے آگاہ ہے کہ اپنے اجتہادات کے اعلان کے بعد عصبیت و تقلید

کے غلاموں کی بارگاہ سے اسکو کیا کیا القاب ملین گے، یہ لوگ کہیں گے کہ ذہنی زندگی کا ماٹو ”مین فوجوان ہوں، مین فوئیر ہوں، مین مدعی ہوں، مین خود پسند ہوں۔ بہتر ہے سب کچھ صحیح۔ مین تمام اُن پر تحقیر اور تشبیہ آمیز گالیوں اور القاب کو نہایت صبر سے برداشت کرنے کی کوشش کروں گا، جو کسی انسان کا غیظ و غور را خراج کر سکتا ہو۔ لیکن مین جانتا ہوں کہ ایک بات کا مین کسی طرح بھی مجرم نہیں ہوں۔ یعنی مین اپنے اعتقاد کو کسی بڑے آدمی کے دامن سے وابستہ نہیں کرتا۔ مین تعصب و تقلید سے کوئی بات نہیں کہتا مین کسی خیال پر صرت اس لیے نہیں اُڑتا کہ وہ قدیم ہے، مسلم ہے اور رائج ہے، یا اسکے مطالعہ اور تحقیق پر مین نے بہت زیادہ وقت صرف کیا ہے۔“

۲۔ عہد جہد و عمل (۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۷ء)

۱۹۳۷ء کی ۱۲ مارچ کو برکھلے نے اپنی عمر کے ۲۲ سال پورے کر کے تھلپوین میں قلم کھا اور پہلی ہی سہ ماہی کے لگ بھگ جون مین ایم اے اور فیلو ہوا جسکے ساتھ ہماری تقسیم کی دس اُس کی زندگی کا پہلا باب بند ہوتا ہے۔ اور اب ہم اس دور مین داخل ہوتے ہیں جسکو انسانی حیات کا حاصل سمجھنا چاہیے۔ اسی دور کے ابتدائی تین سالوں کا کارنامہ ہمارے اس ٹرنٹی کلج کے ایم اے اور فیلو کی فلسفیانہ عظمت کا ضامن ہے۔ یون تو یہ ایم اے ہونے سے چند دن قبل ہی ۱۹۳۷ء کے اوائل مین ٹرنٹی کلج کے بی اے کے پردہ مین حساب الجبرہ پر لاطینی زبان مین دو چھوٹے چھوٹے رسالہ لکھ کر گم نام شائع کر چکا تھا۔ اور اس طرح کمنا چاہیے کہ بائیس ہی برس کے سن مین مصنفین کی صف مین شامل ہو چکا تھا۔

لیکن حقیقت مین جس چیز نے برکھلے کو برکھلے بنایا اور جس کے بغیر ان لاطینی رسائل کا

کوئی نام بھی نہ جانتا، وہ فلسفہ اور فلسفہ کے تصنیفی کارنامے ہیں جن کا مواد گہرے تجویز ہونے کے بہت پہلے سے پاک رہا تھا، اور تعلیقات میں منتشر طور پر یادداشتوں کی صورت میں جمع تھا، ایم اے ہوتے ہی یہ ان تعلیقات کو مرتبہ مدون کرنے کی ادھیر بن میں لگ گیا ہو گا۔ اور غالباً مشہد میں یا اس سے بھی پہلے پریس میں دینے کی نیت سے مفصلاً ترتیب وار لکھنا شروع کر دیا ہو گا۔ لیکن قطعیت کے ساتھ تدوین و تحریر کی مدت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

جدید نظریہ رویت بہر کیف فلسفہ کے آغاز میں جدید نظریہ رویت کے عنوان سے اُس نے اپنے مکمل فلسفہ کا ایک نسخہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس میں خصوصیت کے ساتھ محسوسات بصر سے بحث ہو۔ اور یہ ثابت کیا گیا جو کہ آنکھ سے بجز رنگ اور روشنی کے اور کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ شکل و صورت امتداد و فاصلہ وغیرہ کو محسوسات بصر میں داخل کرنا غلطی ہے۔ تحقیق اگرچہ برکھلے کے اصلی فلسفہ کی صحت تہید تھی۔ لیکن بجائے خود نفسیات و احساس اور مرئیات (آپٹکس) کا ایک ایسا عظیم الشان اکتشاف تھا جس نے علم النفس اور علم المرایا کی تاریخ کا نیا دور شروع کر دیا۔ اور برکھلے کا نام تاریخ فلسفہ کے ساتھ تاریخ حکیات (سائنس) کی بھی ایک غیر منفک کڑی بن گیا۔ اس کتاب نے اس قدر لوگوں کی توجہ کو کھینچا کہ اسی سال دوسرا ایڈیشن چھاپنا پڑا۔ اور مصنف کی اتنی بہت بندھی کہ

مبادی فلسفہ ہی میں جبکہ اسکی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی، اپنا مکمل اور اصلی فلسفہ مبادی علم انسانی کے نام سے شائع کر دیا۔ اس کا حاصل اور نقطہ مرکزی یہ ہے کہ انسان کے ذہن یا روح سے باہر ایک ذرہ کا بھی وجود نہیں۔ مادہ فقط ایک بے معنی لفظ ہے۔ زمین اور آفتاب، چاند اور ستارے، دریا اور پہاڑ، باغ اور درختوں کی ہستی

اور حقیقت اُن ذہنی احساسات کے ماسوا کچھ نہیں جنکو غلط فہمی سے موجودات خارجی کا مثلی یقین کیا جاتا ہے۔ جن چیزوں کو ہم موجودات خارجی کے نام سے پکارتے ہیں وہ دراصل صرف ہمارے ذہنی ارتسبات و نقوش ہیں، جنکو براہ راست ہر وقت ایک بزر روح اخدا، اپنے یقین قدرت سے ہمارے ذہن پر منقش کرتی رہتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ محض نفس یا روح کا وجود ہے۔

مبادی کے ساتھ معاصرین کی یہ فلسفہ کے حرم (مادہ) پر گولہ باری کی ایسی شدید گستاخانہ جرات کی بے اعتنائی تھی جو اپنے پرستاروں کے دل میں غضب کی آگ اور تحقیر و نفرت کے جذبہ کے علاوہ کچھ نہیں پیدا کر سکتی تھی چنانچہ عوام کا تو کیا ذکر خود علماء و کلام فلسفہ کے

حلقوں میں اس ادعا کو دہانے کی بڑے زیادہ وقعت نہیں دیکھی بلکہ شروع شروع میں تو اس آواز کی سماعت تک کاغذوں کو گراں تھی۔ اس کے علاوہ غالباً رکھنے کی کم عمری اور معاصرانہ لاگ نے بھی ایسے مجتہدانہ اور انقلاب انگیز خیال کی جانب لوگوں کو اتنا کرنے سے باز رکھا ہوگا، کچھ بھی ہو، جب اسکو ڈبلن و آئرلینڈ میں کوئی داد نہ مل سکی تو وطن کی فہم رانی سے مایوس ہو کر لندن کے بعض شاہیہ کو مبادی کا ایک ایک نسخہ بھیجا۔ بیان بھی بالعموم تو وہی سلوک ہوا۔ لیکن پھر بھی اُس کو بہت غنیمت جانا چاہیے کہ بیان بعضوں نے اسکو نہ صرف توجہ کے ساتھ پڑھنا روا رکھا، بلکہ اس قابل سمجھا کہ کوئی چوٹی کا شخص اس کا جواب دے، چنانچہ وہ سٹن جو اس زمانہ میں جینیٹ ریاضیات کے پروفیسر کے سربراہ تھے نیوٹن کا کتبچہ میں جانشین تھا، اور بریکلے سے غالباً چند ہی مہینے پہلے مرا لکھا تھا کہ اسکو بریکلے نے ڈبلن میں مسئلہ میں اپنا یہ الہیاتی نظریہ شائع کیا کہ مادہ کوئی حقیقی شے نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں لے تصنیفات کے ذیل میں مبادی کے ذکر میں برسیول کا خط پڑھو۔

بلکہ یہ کہ اسکی حقیقت کا عام اعتقاد اگر مضحکہ خیز نہیں تو بے بنیاد تو قطعاً ہے۔ موصوفے عنایت سے ڈاکٹر کلارک اور جیکو اس کا ایک ایک نسخہ بھیجا جب ہم دونوں اس کو پڑھ چکے تو مین ڈاکٹر کلارک کے پاس گیا اور اس پر گفتگو کر کے یہ کہا کہ مین (الہیات پر عبور نہ رکھنے کی وجہ سے) سٹریٹر کے استدلال کے دقیق مقدمات کا جواب نہیں دیکتا، گوکہ مین اس کے (مہل) نتیجہ کو نہیں تسلیم کرتا۔ لہذا میری خواہش ہے کہ آپ جو ان دقائق کے تہ رس ہیں اور سٹریٹر کے نتیجہ سے متفق نہیں معلوم ہوتے، جواب لکھیں۔ اس سے ڈاکٹر کلارک نے انکار کیا۔

برکے کی ذات میں مذہب و فلسفہ | بالعموم لوگوں کے دلون میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ فلسفہ اور مذہب کا دوش بڑش اجتماع میں قدیم سے ان بن ہے اور ایک کو دوسرے سے دہی بیر ہو جو آگ کو بانی سے ہے، اسی کا اثر ہے کہ فلسفہ اور فلسفی کے لفظ میں مذہب بیزاری اور بیگانگی کا مفہوم التزاماً داخل ہو گیا ہے، لیکن اگر تاریخ فلسفہ کو سامنے رکھ کر استقصا کیا جائے تو اغلباً ایسی مثالیں بہت زیادہ نکلیں گی جنہیں فلسفہ اور مذہب دوش بدوش رہا ہے۔ برکے بھی اسی غلبہ قعداد کا ایک نمایان رکن ہے۔ وہ اس حقیقت کا قائل ہے کہ اگر انکری رفت و سترت کا سبب وحکمت و فلسفہ ہے تو اخلاقی اور اجتماعی سعادت کا سرچشمہ مذہب تدین ہے، چنانچہ جہاں اس کا دماغ حکیمانہ انداز سے برسرِ دہان اس کا ہاتھ انجیل سے مشغول ہے۔ اسکی شخصیت کلیسا کے معبر پر نظر یہ جدید و مبادی کے صفحات سے اتنی مختلف نظر آتی ہے کہ یہ باور کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ وہی برکے ہے۔ اسکے وعظون کی بنیاد تمام تر انجیل کی آیات پر ہوتی ہے۔

سہ یہ پوری عبارت فریز نے یادگار کلارک، مصنفہ مہٹن کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ سیمول کلارک اپنے زمانہ کا بہت نامور عالم فلسفی متکلم اور ریاضی دان ہے۔ برکے نے خود سہادی میں ایک جگہ اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔ سہ افاعت غیر متعلقہ انا اور مقالہ بنام حکام وغیرہ پڑھو۔

اُسکی تلقینات کتاب مقدس کے اقتباسات سے پُر اور مذہبی رنگ میں دینی موعی ہوتی ہیں۔ ہم خوفِ طوالت سے بیان کوئی حصہ نہیں نقل کر سکتے۔ لیکن انگریزی انون کیلیے ان وعظوں کا پڑھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تدریسی اور کلیسائی خدمات | اتفاق کی خوبی دیکھیے کہ زندگی کے یہ دونوں پہلو خارجی اوقات میں طابق النعل بالنعل ہیں نظریہ جدید کے نکلنے سے کچھ ہی قبل اس کا مصنف کیم فروری کو اپنے ہی کالج کے کلیسا کا ڈوٹکین مقرر ہو چکا ہے۔ اس مذہبی عہدہ کا کام طلبائے کالج کو وعظ و تلقین تھا باقاعدہ اس فرض پر مامور ہونے سے پہلے بھی یہ اس خدمت کو انجام دیتا ہوگا۔ چنانچہ جو وعظ اسکے فریئر نے جمع کیے ہیں ان میں سب سے پہلا جنورشی کا ہے اور غالباً اُس کے ذاتی ہی شغف و میلان مذہبی کو دیکھ کر اس کو مناسب دینیہ کی ابتدا کی عزت دی گئی ہوگی جہاں سے یہ بڑھتے بڑھتے آخر کار بشپ کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوا پھر سلمہ میں سب لکچر نام زد ہوا۔ جو تدریسی عہدہ تھا، اور ساتھ ہی ساتھ اسی سال نومبر میں جوئر ڈوین کا رتبہ حاصل ہوا جو ڈوٹکین سے بلند ہے۔ دو سال کے بعد ۱۸۷۳ء کے نومبر میں لوانی زبان کا جوئر لکچر مقرر ہوا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ لوانی کا اچھا خاصا ماہر تھا۔ لاطینی پر تو اس کو اتنا عبور تھا کہ اس میں ایک سے زائد کتابیں لکھیں۔ اُسے ان قدیم زبانوں کو اس طرح نہیں پڑھا جس طرح ہمارے کالجوں میں طلبہ عربی فارسی زبان ثانی پڑھتے ہیں جس سے بجز امتحان پاس کرنے کے اور کوئی کام نہیں لے سکتے۔ ان تمام تدریسی اور کلیسائی خدمات سے فریئر کے بیان کے مطابق تقریباً ۴۰ ماہ و نو سال کی آمدنی تھی جو موجودہ سکے کی دس ٹیڑھ سو پانچ سو کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

غرض ایم اے ہونے کے بعد سے ۱۸۷۳ء کے اوائل تک تقریباً چھ سال کا زمانہ

ان تدریسی اور کلیسیائی فرائض منصبی کی انجام دہی اور طالعہ و تصنیف کے خالص علمی مشاغل میں بسر ہوا۔ اس مدت کو اسکی خاموش اور بے خلل عالمانہ زندگی کا عہد سمجھنا چاہیے جو پھر سولہ برس کے بعد وہائٹ ہال میں جا کر نصیب ہوا۔ فریزر کی تحقیقات کے بہ موجب اسی عہد میں ۱۲۰۰ء میں چند دن کے لیے تبدیل آب و ہوا اور بعض دوسرے اسباب سے یہ انگلستان گیا، جسکی بابت ہمکو کچھ اور تفصیلی حال نہیں معلوم۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے آئرلینڈ سے باہر قدم نکالا۔

اطاعت غیر متادانہ پر وعظ | ۱۲۰۰ء میں جو نیرڈین کی حیثیت سے اُس نے کانج کے کلیسا میں غیر متادانہ اطاعت پر تین وعظ کئے تھے، جنکی بنیاد انجیل کی ان آیات پر ہے کہ جو آدمی طاقت کی مقاومت کرتا ہو وہ خدا کے حکم کی مقاومت کرتا ہو، اور توفیق و جزا کا مرکب نہ ہونا، تو جھوٹی قسم نہ کھانا، تو اعلیٰ طاقت کی مقاومت نہ کرنا، ان آیات سے عیسائی دہی کام لیتے ہیں جو مسلمان اولی الامیں منکھ سے، اگرچہ ۱۲۰۰ء کے انقلاب کے بعد سے انگلستان میں شاہی اقتدار اور شخصیت کا کہنا چاہیے خاتمہ ہو چکا تھا، لیکن ٹورنیر اور گزنام سے جو دو جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں جنکو ہم علی الترتیب شاہ پسند اور امین پسند کہہ سکتے ہیں اور وہ کسی نہ کسی صورت میں باقی چلی آتی تھیں اور اب تک قائم ہیں ان میں سے کبھی ایک برسر اقتدار ہو جاتی تھی اور کبھی دوسری ۱۲۰۰ء میں ملکہ اینبی کی حکومت کا آخر زمانہ تھا، اور شاہ پسندوں کا دور دورہ تھا۔ لازماً ان وعظوں سے یہ افواہ پھیل گئی کہ برکلے اس عجا کا حامی اور طرفدار ہے، اسی افواہ کی تردید کے لیے ۱۲۰۰ء میں اُس نے ان تین خطبات کو ایک چھوٹے سے رسالہ کی شکل میں شائع کروایا۔ لیکن جو خیال دلوں میں جم گیا تھا اس کا نکلتا آسان نہ تھا، چنانچہ اس کی بدولت، جیسا کہ آگے چکر معلوم ہوگا، اُس کو تھوڑا سا نقصان بھی

اٹھانا پڑا۔ آج کل جبکہ شخصیت اور استبداد کے خلاف بات بات پر علم بغاوت بلند کر دینا حریت و آزادی کا شعار خیال کیا جاتا ہے، ان خطبات کا پڑھنا حیرت و دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اپنے قارئین کے استجاب کے لیے اس رسالہ کے 'تعارف' کی چند سطریں ہم یہاں تقابلاًس کیے دیتے ہیں۔

”یہ امر کہ کسی سیاسی طاقت کی علی الاطلاق غیر مقادمانہ اطاعت نہیں جائز ہے بلکہ کسی حکومت کی فرمانبرداری سوسائٹی کی عام فلاح کے ساتھ مشروط و محدود ہونی چاہیے اسی لیے جب عامہ خلق کی یہود کے لیے علانیہ طور پر ضرورت محسوس ہو تو رعایا جائز طور پر حکمران قوت کے خلاف مقادمت کر سکتی ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ ایسا کرنا ان پر واجب ہے کیونکہ رفاہ عالم کی ترقی تمام لوگوں کا ناگزیر فریضہ ہے۔ یہ اور اس قسم کے خیالات جنکو میں بنی نوع انسان کے لیے تباہ کن اور عقل سلیم کے قطعاً مخالف خیال کیے بغیر نہیں رہ سکتا، گزشتہ چند سالوں سے ملک کے قابل و تعلیم یافتہ گروہ کی جانب سے نہایت مستعدی کے ساتھ پھیلانے جا رہے ہیں اور انتہائی فوائد کی روشنی میں پیش کیے جاتے ہیں لہذا یہ ضروری معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے نوجوانوں کو ان کے خلاف مسلح کر دیا جائے اور اس بات کا اہتمام رکھا جائے کہ وہ جب دنیا میں داخل ہوں تو صحیح اور عمدہ اصول کی رہنمائی میں داخل ہوں۔ میرا یہ نشانہیں کہ کہ وہ اندھے پن سے کسی ایک خاص گروہ کے ساتھ متعصب ہو جائیں بلکہ صرف یہ کہ شروع ہی سے وہ اپنے فرض اور اس کے روشن اور عقلی دلائل سے آشنا کر کے ایسے اعمال کے لیے مستعد و مضبوط بنا دیے جائیں جن سے وہ پورے عیسائی اور اطاعت شعراء رعایا معلوم ہوں

اس مسیحی یا سیاسی عقیدہ کے خطا و صواب سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے

خارج ہو۔ لیکن اتنا بغیر کہ نہیں رہ سکتے کہ استدلالی حیثیت سے یہ خطبات نظریہ جلد اور
مبادی کے مصنف کی شان سے بہت پست اور کم تہہ ہیں، ان چند بندوں کو چھوڑ کر
جن میں ضمناً اس نے اپنے فلسفہ اخلاق کا ذکر کیا ہے اور جو ایک طرح کی مذہبی افادیت
ہے۔ جس سے ہم کسی دوسرے موقع پر تفصیلاً بحث کریں گے باقی سارا رسالہ سقیم اور مبالغہ
آئیزدلائل سے بھرا ہے، اسی کا یہ نتیجہ ہوا، ہنگامہ خرمین اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے
کہنا چاہیے کہ اضطرابِ اسیرِ افگندہ ہو جانا پڑا ہے۔

سفر و سیاحت | ۱۳۳۷ء سے لیکر ۱۳۴۷ء تک بیس سال سے زیادہ کا زمانہ وطن سے باہر
انگلستان، فرانس، اٹلی، اور جزیرہ روم و دیگرہ کی سیاحت میں بسر ہوا۔ اس میں کل
دھالی تین سال کے لیے بیچ میں برکے آئرلینڈ گیا، باقی ساری مدت تھوڑے تھوڑے
وقفوں کے ساتھ سفر میں گزری۔ غالباً فروری یا مارچ ۱۳۳۷ء میں یہ لندن پہنچ گیا۔ یہاں
اُس کے متعدد محرکات قیاس کیے جانے ہیں، مثلاً علمی حوصلہ مندیان سیر و سفر کا شوق، اصلاح
وغیرہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی کوئی نمایاں اور ممتاز کام کرتا ہے تو قدرتا اس کو خواہش
ہوتی ہے کہ باہر نکلے اور لوگوں سے مل جل کر دیکھے کہ اُس کی نسبت کیا خیالات رکھتے ہیں اس
کیونکر پیش آتے ہیں۔ اس کے کارناموں کی کیا وقعت ہے۔ یہ ایک ایسی فطری خواہش ہے
جس سے زاہد و صوفی، حکیم و فلسفی کوئی خالی نہیں ہو سکتا، البتہ اکثر یہ تحریک اتنی مخفی
ہوتی ہے کہ آدمی کو خود شعور نہیں ہوتا۔ ٹرنیٹی کالج ڈبلن کی چار دیواری اس حد تک تسکین
بخشی کے لیے اب بہت تنگ تھی مصنفِ مبادی کی حوصلہ مندانہ آرزوں کے لیے
وسیع تر میدان درکار تھا۔ لندن ہر قسم کے اربابِ کمال اور زندگی کی جولانیوں کا مرکز
تھا۔ بس اہل میں ہی پہنان۔ لیکن قومی محرک تھا، جو لندن کھینچ لایا۔ باقی صحت غیر زیادہ

زیادہ اس اصل محرک کے تائیدی اسباب قرار دیے جاسکتے ہیں۔

لندن میں مشاہیر سے ملاقاتیں | چنانچہ لندن پہنچتے ہی وہ تمام مشاہیر سے ملنے جلنے میں بھرپور نظر آتا ہے، جناتھن سو فٹ جسکی کتاب گلوبس ٹراول سے اسکول کا ہر لڑکا واقف ہے، سیاسی اور علمی دونوں حلقوں میں ایک بارسوخ شخص تھا، اور برکے کو ٹرنٹی کالج ہی کے زمانہ سے بخوبی جانتا ہوگا۔ اس نے غالباً سب سے پہلے اُس کو لارڈ برکے آن اسٹریٹ میں سے اُس کے عزیز کی حیثیت سے ملایا۔ پھر اور وزرا و امرا سے اُس کا تذکرہ کیا۔ اسکی کتابیں اُنکو ہریتہ دین۔ لارڈ برکے نے اپنے اس قابل صد نازش عزیز کو بشپ اٹیربرمی سے ملایا جو خود نامور اور ممتاز عالم تھا اور اس ٹیمن کے فلسفی کا پہلے ہی سے شتاق تھا جب ہمارا برکے اٹھا چلا آیا، تو لارڈ برکے نے بشپ سے پوچھا، کہ آپ نے میرے اس عزیز کو اپنی توقعات کے مطابق پایا۔ اُس نے نہایت حیرت سے اپنے ہاتھ اٹھا کر کہا کہ میں جب تک اس شریف انسان سے نہیں ملا تھا، اس قدر عقل، اس قدر علم، اس قدر معصومیت، اور اس قدر تواضع کو صرف فرشتوں کا حصہ خیال کیا کرتا تھا، اُسی زمانہ میں یہ مشہور شاعر پوپے ملا، ایڈرین سے بھی ملاقات کی جسکی شاعرانہ اور ادبی شہرت کا شباب تھا، ایڈرین ہی کے اشارہ سے برکے اور سیول کلا رک (جسکا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں) کے امین مباحثہ کی ایک صحبت قرار پائی جس کا نتیجہ کہا جاتا ہے، برکے کی اس شکایت سے کچھ زیادہ نہ بھلا کہ ”میرا حریف اگرچہ میرے دلائل کا جواب نہ دے سکا، لیکن انصاف و بے تعصبی کی اتنی جرأت نہ رکھتا تھا کہ اپنی تسکین یا شکست کا اعتراف کر لیتا“ اس قسم کی مناظرانہ گفتگو کو علمی جوش اور اُمنگ کا ایک تماشہ سمجھنا چاہیے۔ ورنہ بحث و مباحثہ سے کہیں لوگوں کے عقائد و اذعانت بدلا کرتے ہیں۔ آزاد خیالوں کے خلاف گارجین میں مضامین | جس طرح ہمارے ملک میں جدید تعلیم و خیالات کے

اثر سے ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جو روشن خیال یا آزاد خیال کے لقب سے فخر اندوز ہے، اور جس کے نزدیک مذہبی دعاوی کی حقیقت ایک فسانہ کہن یا عیدِ جہالت و توحش کی یاد گار سے زیادہ نہیں۔ اسی طرح علم و حکمت کی نئی نئی تحقیقات و انکشافات نے بعینہ اسی نوعیت کی ایک جماعت انگلستان میں پیدا کر دی تھی، جو وحی و الہام، شرف و نشر روح و خدا وغیرہ کے اعتقادات کو محض حدیث خرافات جانتے تھے اور رسائل اخبارات میں انکی ہنسی اڑاتے تھے۔ ان لوگوں نے بھی اپنے لیے آزاد خیال کا نام اختیار کیا تھا۔ لندن میں ان کا نہایت زور شور تھا، برکے کی دینی حمیت و غیرت بھلا اسکی کب روادار ہو سکتی تھی۔ اتفاق سے اسی سلسلہ میں سر رچرڈ اسٹیل نے ایک بنا روزانہ پرچہ کا رچین کے نام سے جاری کیا، ہمارے پرجوش مذہبی فیلسوف نے ان آزاد خیالوں کے خلاف اس میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جو کئی مہینے تک جاری رہا، سب سے پہلا مضمون کوئٹنس انتھونی کی تردید میں ہے جو اس طائفہ کا سرگروہ اور ارتیابی عقیدہ کا ایک مناقشہ پسند مصنف تھا۔ آزاد خیالی انسانی حریت، وغیرہ کے عنوان سے متعدد کتناہین لکھی ہیں۔ لاک سے اتنے تعلقات تھے، کہ مرتے وقت اپنی کچھ جائداد اسکے لیے چھوڑ گیا، برکے کے یہ تمام مضامین جنکی تعداد ۱۴۱ ہے، تشلی استدلالات پر مبنی ہیں۔ خطابیات اور انشا پر از می کا بھی کافی چٹخارہ ہے، چہنیت مجموعی برکے کی جانب ان مضامین کی نسبت سے اُسکی وقعت میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا، کہا جاتا ہے کہ ان مضامین کا وہ معاوضہ بھی لینا تھا، جو فی مضمون ایک گنتی تھا، کوئی مضمون تین چار صفحات سے زیادہ کا نہیں ہے، ہمارے ملک کے صحائف نگاروں کو اس مثال سے ہمت حاصل کرنی چاہیے۔

مکالمات اہلس کی اشاعت | لندن کے اُسی زمانہ قیام میں برکے نے مکالمات مابین

ہائلس و فلوئس کے نام سے تین مکالموں کا ایک مجموعہ شائع کیا یہ مبادی کے فلسفہ و خیالات کی زیادہ عام فہم تعبیر تھی، تاکہ زیادہ وسعت سے ان کی اشاعت ہو چنانچہ نظریہٴ رویت و مبادی دونوں سے زیادہ ان کو مقبولیت حاصل ہوئی، فریڈ نے اسپرچو دیباچہ لکھا ہر اس کا پہلا جملہ یہ ہے کہ "یہ کارنامہ انگریزی کے لٹریچر الہیات کا گوہر درخشان ہے، اسکی تیاری و ترتیب میں غالباً برکلی سلمہ میں یعنی لندن آنے سے پہلے ہی صورت تھا۔ بس یہ آخری کتاب ہے جس کے بعد کہنا چاہیے کہ پھر قریباً ۱۹ سال کے لیے اسکی تصنیفی زندگی پیچھے بڑھ گئی۔

فرانس واطلی | اسی سلمہ کے نومبر میں لندن کے دربار کی جانب سے مورڈونٹ ارل آف پیٹر بورڈ سسلی کا سفیر مقرر ہوا، انگلستان کے عائد و امرا کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنے لیے ایک مخصوص پادری رکھتے ہیں جو انکو اور انکے گھر والوں کو گرجا کرتا ہے اور مذہبی فرائض انجام دیتا ہے اس پادری کو چیلپین کہتے ہیں۔ سوفٹ کی سفارش سے مورڈونٹ نے ہمارے برکلی کو اپنا چیلپین، اور سکرٹری بنا کر ہمراہ لیا۔ یہ قافلہ لندن سے سیدھا پیرس پہنچا، جہاں سے ۲۵ نومبر کو برکلی اپنے کلکنی اور ٹریٹی کا ج کے پرنس یارٹامس پر اتر کر برکلی کے سب سے زیادہ خطوط اسی کے نام ملے ہیں جن میں غایت محبت و بے تکلفی سے اس کو ڈیر ٹرام سے مخاطب کرتا ہے، کو سب سے پہلے خط میں لکھتا ہے کہ "جب سے میں یہاں آیا ہوں، چرچ، خانقاہوں، شاہی محلات، کالجوں وغیرہ کے دیکھنے میں مہمک ہوں یہ علمائین اس شہر میں نہایت کثیر التعداد اور شاندار ہیں، ان کی عظمت و غوثی یقین سے باہر ہے۔" اسی خط میں لکھا ہے کہ "کل فادر میلے براہمکا سے لکر بعض مسائل پر گفتگو کا ارادہ ہے، لیکن پھر غالباً مل نہیں سکا۔ یہاں سے تقریباً ایک ماہ کے قیام کے بعد واطلی کا رخ کیا اور کوہ آپس کی

دشوار گزار راہ اختیار کی۔ طبیعت میں شوخی و ظرافت کافی موجود ہو، خطوط میں واردات سفر نہایت دلچسپ انداز سے بیان کیے ہیں۔ اٹلی میں داخل ہو کر شہر ٹورین سے ۹ جنوری ۱۸۸۷ء کو پھر ٹورین کو لکھتا ہے ”راہ بھر میں بس کل چار بار گھوڑے پر سے گر کر آخر صحیح و سلاست پہنچ گیا ہوں، جس سے اس کے علاوہ کچھ نقصان نہیں ہوا کہ لوہار گھڑی اور تاس کی ڈبیا ٹوٹ گئی۔ راہ کی ہیبت و خطرات بیان کرتے لکھتا ہے کہ ”اب میں ہوا، موسم خشکی و دریا بالا اور برف سے مقابلہ کرنے کے لیے مضبوط ہو گیا ہوں“ لیکن آگے چل کر لکھتا ہے کہ ”میری نصیحت ہے کہ احباب سلی جاتے ہوئے کبھی ایس کی راہ نہ اختیار کریں۔“

سال بھر کے اندر پھر لندن ایس | اگست ۱۸۸۷ء میں دفعۃً ملکہ اینی کا انتقال ہو گیا۔ جانے نہ تخت میں ہوتے ہی ٹورین جماعت کے تمام وزراء اور کان کو جو اسکی تخت نشینی کے خلافت ایک ایک کر کے نکال دیا۔ اور اسی عتاب کی لپیٹ میں لارڈ مورڈنٹ بھی آگیا اور پورا سال بھی نہونے پایا تھا کہ بریکے کو اپنے دلچسپ سفر سے اگست ہی میں لندن واپس آنا پڑا۔ لیکن اُس نے دس مہینے کی مدت میں فرانس کے علاوہ جینوا، لگ ہارن وغیرہ اٹلی کے بہت سے مشہور مقامات کی سیر کر لی۔

کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں بریکے کے ایک لائق شاگرد مولی نیوکس نے جو اب شہزادہ ویس کے سکریٹری کے عہدہ پر فائز تھا، اپنے فلسفی استاد کو شہزادہ اور شہزادی سے ملا کر ان کو شش کی کہ اسکو آئرلینڈ میں کوئی معقول کلیسا کی منصب بجائے، چنانچہ شہزادی آئرلینڈ کے لارڈ جسٹس گلوے سے سفارش بھی کی لیکن گلوے کے قانون میں اطاعت غیر مقادمانہ کے دغظون کی افواہ پڑ چکی تھی جسکی وجہ سے یہ بریکے کو مشتبہ نظر سے دیکھتا تھا، اور ٹورین کا حامی سمجھتا تھا، مولی نیوکس نے اس شبہ کو دور کرنے کی بھی کوشش کی مگر نتیجہ نہیں

محل سکا۔

سلسلہ میں فرانس اٹلی کا سفر ان چند مہینوں کی سیر سے برکھلے کے فوقِ سیاحت کی تسکین تو کیا ہو سکتی تھی بلکہ زندگی کے تازہ تجربات اور نئے نئے مشاہدات نے اس خواہش کو اور تیز کر دیا ہوگا۔ اتفاق یہ کہ اگلے ہی سال اس کے لیے ایک اور سامان پیدا ہو گیا۔ کلوگر کا بشپ ڈاکٹر اپنے اپنے لڑکے کے جارج ایٹنے کو بری یورپ کی سیاحت کے لیے بھیج رہا تھا۔ برکھلے سے خواہش کی۔ یہ حیثیت ٹیوٹر کے اُس کا ہمراہی قبول کرے، ابکی یہ سلسلہ سے لیکر ستہ تک تقریباً پانچ سال باہر رہا، اور غالباً یورپ کے اکثر مقامات کی سیر کی ہوگی، لیکن ہمارے پاس فرانس اور اٹلی سے آگے بڑھنے کی کوئی قطعی شہادت موجود نہیں ہے،

سلسلہ کی ۱۳ اکتوبر کو پیرس میں میلے برانکا مارا، اسکی موت کے سبب سب کی نسبت اسٹاک نے برکھلے کی سوانح عمری میں ایک عجیب قصہ لکھا، جس کا اصل یہ ہے کہ برکھلے اس سے ملنے گیا۔ یہ بھی پڑے کے مرض میں مبتلا تھا، اور بڑھا ہوا کچھ دوا بکھا رہا تھا، باتیں ہوتے ہوتے برکھلے کے نظریہ پر گفتگو چھڑی۔ مباحثہ کی گرا گرمی میں بوڑھے فلسفی نے اپنی آواز اتنی بلند کر دی اور استغدر جوش سے بھر گیا کہ اسکی بیماری ترقی کر گئی جسکی بدولت چند ہی روز میں مر گیا۔ روزنامہ سیاحت سلسلہ تو اغلباً فرانس ہی میں ختم ہوا۔ سلسلہ ۱۹ سلسلہ میں ہوگا بالکل نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہا اور کیا کرتا رہا۔ باقی سلسلہ اور سلسلہ کا اکثر حصہ یقیناً اٹلی ہی میں بسر ہوا۔ یہاں یہ اپنے واردات کا روزنامہ نہایت اہتمام اور تفصیل سے قلم بند کرتا رہا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس میں سے باوجود حادثہ نے، کہنا چاہیے، صرف چند اوراق ہمارے لیے چھوڑے ہیں، لیکن ۶

قیاس کن زگلستان من دہار مرا

ہم انہی باقی ماندہ اوراق سے بہت کچھ نتیجہ نکال سکتے ہیں، اس روزنامہ کی سب سے پہلی

تاریخ، جنوری سلسلہ ہر، اور سبب اخیر ۱۳ اپریل سلسلہ باقی بیچ میں رخنے مہینوں کے
ہیں کل تقریباً ۱۰ صفحات ہیں۔

نظر کی ہر گیری | ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے اٹلی کا کو نہ کو نہ چھانٹا ہے۔
عام قاعدہ ہے کہ سیر و سفر میں ہر آدمی کی نگاہ اپنے مخصوص مذاق کی چیزوں پر پڑتی ہے۔ لیکن
ہمارے سیاح کی نظر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ کسی صنف و مذاق کی قابل لحاظ چیز اسکی توجہ سے
محروم نہیں رہتی۔ جس جگہ اس کا گذر ہوتا ہے پورا جغرافیہ لکھ دیتا ہے۔ حدود و رقبہ، آبادی
پہاڑ، دریا۔ پیداوار تجارت، سطح کی بلندی وستی، سمندر سے فاصلہ ہر چیز کو اس کی بیان
محیط ہوتا ہے۔ قدیم و جدید عمارات، تصاویر و مجسمات وغیرہ کو ناقدانہ نگاہ سے دیکھتا ہے، انکے
حُسن و قبح کو واقف کار فن کی طرح بیان کرتا ہے، تاریخی یادگارین یا مقامات جب سامنے
آتے ہیں تو وہ ان کے متعلق دلچسپ تاریخی حوالے دیتا جاتا ہے۔ نیپلس کے حالات میں ان کا
سارا نظام حکومت درج کر دیتا ہے۔

قومی عوائد و مراسم لوگوں کے مادات و خصائل کے مطالعہ کے لیے خطرات تک کی
نہیں پرواہ کرتا۔ جزیرہ انیم کے حالات کے ذیل میں پوپ کے خط میں لکھتا ہے کہ اس دلکش
جزیرہ کے باشندے، چونکہ دولت و ثروت سے خالی ہیں، لہذا ان بُرائیوں اور حماقتوں سے
بھی بری ہیں جو اس کا لازمہ ہیں، اور اگر یہ لوگ انتقام جوئی سے بھی اسی قدر بیگانہ ہوتے
جتنا مال و متاع کے حرص و حوصلہ سے ہیں تو عہد زریں کے شاعرانہ تخیل کی تصدیق ہو جاتی،
لیکن ذرا ذرا سی بات پر قتل و خونریزی کی قبیح عادت انکے لطف و مسرت کا ایک ناپاک
جز بن گئی ہے جسکی ایک مثال ہمارے یہاں پہنچنے کی دوسری ہی رات پیش آئی، یعنی
ایک ۸ سال کا نوخیز ہمارے دروازہ ہی پر مار ڈالا گیا۔ لیکن چونکہ ہم کو اپنے کام سے کام

تھا، اس لیے ان خطرناک لوگوں میں صحیح و سلامت زندہ رہے۔

ہیٹل، دریا، سبزہ زار وغیرہ قدرتی مناظر کے ساتھ حد سے زیادہ دلچسپی ہو رہی خط
نہ کو رہا لاکٹرے کے علاوہ، باقی تمام تر انہی چیزوں سے پرہیز جنکو نہایت مزے لے لے کر
بیان کیا ہوا ایک اور خط میں تین صفحے سے زیادہ کوہ و سہولت کی آتش نشانی کے فروغ
کے بعد خود ہیٹل پر جا کر حمان نہایت وقت سے پہنچ سکا ہر ایک ایک چیز کو دیکھا اور نہایت
خوبی سے بیان کیا ہوا

کوئی عجیب بات سن پاتا ہوں اس کی تحقیق کے پیچھے پڑ جاتا ہوں جنوب اٹلی میں
جب سیر کر رہا تھا، تو معلوم ہوا کہ یہاں بعض مقامات خصوصاً ٹریٹو میں ایک بہت بڑی مکڑی
ہوتی ہے جسکے کانٹے سے آدمی اکثر مر جاتا ہے، اس کا علاج کا بیان کیا جاتا ہے جسکے اثر سے
آدمی گھنٹوں ناچتا رہتا ہے، اور کبھی ناچتے ہی ناچتے مر جاتا ہے۔ ہمارے متجسس مزاج شاہ
نے کئی جگہ اپنے روزنامہ میں اس کا ذکر کیا ہے، لوگوں سے اُسکے متعلق استفسارات کیے
خود ایک آدمہ باری عجیب و غریب ناچ دیکھا ہے۔ اور جو شواہد جمع کیے ہیں ان سے اس کا میلان
اسکی تصدیق کی جانب معلوم ہوتا ہے۔

ستمبر کے مہینہ میں جب بہ اٹلی کی سیر میں مشغول تھا، اپنے کالج میں جو نیا پوسٹر سیر فیو
منتخب ہوا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ٹریٹو کالج سے اس کا تعلق منقطع نہیں ہوا تھا، بلکہ اسے
لیکچر جب یہ کالج سے نکلا اسے غمک جب یہ واپس گیا برابر رخصت پر تھا جسکی تفتاؤ تھا
ہوتی رہی۔ اب ہم اس روزنامہ کی سب سے پہلی تاریخ کی چند اون سطور کے اقتباس پڑھیں
یورپ کے ایام سفر کو ختم کرتے ہیں۔ اس تاریخ یعنی، جنوری کو وہ ویٹلی گان کے شہر
لہرم کے ایک شہزادہ شاندار سلطنت عمارت کا نام پڑ جیسے پوچھا، عجائبات لاہور کی کلیسا وغیرہ شامل ہیں

کتبخانہ کے دیکھنے میں مصروف رہا۔ اس اقتباس سے ہمارے اوپر کے بیانات کی ایک حد تک تصدیق ہوگی کہ اُسکی ہمہ گیر نظر صرف نادر کتابوں یا اپنے خاص مذاق کی کتابوں کی دیکھ بھال تک نہیں محدود ہے۔ بلکہ ہر شے کے لیے جو ہر شناس نگاہ رکھتا ہے۔

دیکھان کی لائبریری کی سیر | ”آج صبح میں نے ویٹکان میں ایک گیلری کو قدموں سے ناپا، جو ۸۸۸ قدم لمبی تھی، ہم نے اس قصر کا مشہور کتب خانہ دیکھا، اُس میں قلمی اور مطبوعہ سب سے بہتر نذر کتابیں ہیں، یہ اپنی قسم کی بے نظیر عمارت ہے، جو تناسیب کے لحاظ سے نہایت خوبصورت اور شاندار ہے، اور اسکی تصاویر بہترین ہاتھوں کی دستکاری ہیں۔ اسکی شکل یہ ہے —، سب سے بڑا المبان قریباً ۱۰۰ فٹ کا ہے، تمام کتابیں ڈسکون یا ٹیکنون میں چنی ہوئی ہیں، جو دیوار سے لگا کر کھڑے کر دیے گئے ہیں۔ یہ تمام ڈسک بلندی میں برابر اور اتنے نیچے ہیں کہ سب سے اوپر کی کتاب بھی بلا کسی زحمت کے لمس کی جاسکتی ہے، ہر حصے اور حصے کا ایک قلمی نسخہ دیکھا جو چودہ سو سال سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کے شروع انیڈ کی چار متنازع فیہ نظمیں نہیں تھیں۔ ایک اور اس سے بھی پُرانا نسخہ ہیکو دکھلا گیا۔ لیکن وہ ناقص تھا، یہ دونوں نسخے نہایت جلی اور گنجان خط میں لکھے تھے، پہلے میں اوقات تھے، دوسرے میں مطلق نہیں۔ دونوں تصویروں سے مزین تھے۔ لیکن پہلے کی تصویریں دوسرے سے بہت زیادہ حشیانہ نہیں، جسکی بنا پر خیال کیا جاتا کہ یہ دوسرا کم پُرانا ہے۔ ایک نسخہ طرس کا بھی دیکھا، جسکے خصوصیات سے ہم نے فیصلہ کیا، کہ یہ بھی اتنا ہی پُرانا ہے۔ ایک نسخہ نہایت قدیم زمانہ کے سبکو اجنٹ کا دیکھا۔

ہنرمی ہشتم کے (انا بولین کے نام) عاشقانہ خطوط دیکھے۔ اور اُس کی وہ کتاب

۱۰۰۰ روم کا ایک اور شاعر جس نے ہومر کے ایازہ کے نمونہ پر اینڈ کی رزمیہ شوی لکھی۔

۱۰۰۰ ڈرا نوئس شاعر کا نام ہے

۱۰۰۰ یہ لفظ لاطینی سے ماخوذ ہے جسکے معنی شکر کے ہیں جو عہد عتیق کے اس یونانی ترجمہ کا نام پڑ گیا ہے، جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۷ آدمیوں نے مل کر کیا ہے۔

جو اُس نے لو تھر کے خلاف لکھی تھی اور جسکی بدولت اسکو حامی دین کا لقب ملا تھا، اُسکے
 اول میں پوپ کے نام کا جو خط منسلک ہوا اُس میں اُس نے صراحت کے ساتھ اسکی تصنیف کو
 اپنی جانب منسوب کیا، ہوا اس پر بریری نظر اس لیے پڑی کہ لوگ اس میں شک کرتے ہیں
 تیسرے پر کوہنے اُن مجسموں کو دکھایا، جو ڈیکان کے روکار والے حصہ میں ہیں جنہیں
 سے خاص خاص یہ ہیں، کلیو پٹر، اپالو، مشہور و کون، اور انٹینس یہ زمانہ قدیم کے
 کمالات کے بہترین نمونے ہیں۔ اپالو اور لو کو کون کی تعریف کا تو کبھی حق نہیں ہو سکتا۔
 سلسلہ میں پیرس کی روائٹل اکاڈمی کی جانب سے ایک انعامی مضمون کا اعلان
 ہوا، جس پر بریکلے نے بھی ۲۰۔۵۰ صفحہ کا رسالہ لاطینی زبان میں لکھا، اور اٹلی سے اسی
 اُس کو اکاڈمی میں پیش کیا ہو گا۔ لیکن انعام ایک اور شخص کو ملا جسکی وجہ یہی سمجھنا چاہیے کہ
 یورپ ابھی اتنا بے تعصب نہیں ہوا تھا کہ اُن اجتہادات کو قبول کرے جن سے ہزاروں برس
 کے مسلمات کی تردید ہوتی ہو، یہ رسالہ دراصل مبادی کی ایک کڑی ہو عام خیال یہ ہو کہ
 بے جان موجودات خارجی باہم ایک دوسرے کی علت و معلول ہوتے ہیں مثلاً آگ کا غد
 کو جلاتی ہو۔ پانی آگ کو بجھاتا ہو۔ اس رسالہ میں اسی کی تردید کی گئی ہو، اور یہ ثابت کیا
 گیا ہو کہ محسوسات میں کوئی شے کسی شے کی علت نہیں ہو سکتی، بلکہ حقیقی علت صرف نفس یا روح کا
 ارادہ ہو۔ یہی وہ ماس ہو جس پر آگے چلکر ہیوم نے اپنے نظریہ علت کی عمارت کھڑی کی
 یہ رسالہ لندن میں ۱۷۷۰ء میں پہلی بار چھپا۔

۱۷۷۰ء کلیو پٹر، مصر کی یونانی نژاد مشہور ملکہ جو اپنے حسن و جمال جبرائیل اور مجسموں کے لیے شہرہ آفاق ہو
 ۱۷۷۰ء آپالو، روشنی کا دیوتا ۱۷۷۰ء انٹینس روم کے ایک نامی شاہنشاہ ایزیرین کا محبوب و مقرب ہو جو ان جیکو
 اُس نے متنبی کیا تھا اور جسکے نام شہر اینٹاپولس بسایا ۱۷۷۰ء آپالو کے معبد کا ایک مجاور (پریسٹ)

سلسلہ کے آخرین انگلستان | غرض غالباً سلسلہ کے آخرین ہمارا فلسفی سیاح فرانس ہوتا ہوا،
 فرانس اور بحر جنوبی کا فتنہ | بھرا انگلستان واپس آگیا۔ اس نے مانہ میں سارا ملک خصوصاً لندن
 بحر جنوبی کی اسکیم کی تباہی کے فتنہ و آشوب میں گرفتار تھا جسکی محل حقیقت یہ ہرگز کہ وہیم ^{لٹ}
 کے عہد حکومت کی لڑائیوں کی بدولت گورنمنٹ جس قومی قرضہ سے زیر بار ہو گئی تھی، وہ
 بڑھتے بڑھتے پانچ کروڑ تیس لاکھ پاؤنڈ تک پہنچ گیا تھا، اس کا صرف سود تیس لاکھ پاؤنڈ سالانہ
 ادا کرنا پڑتا تھا، جو سلطنت کی آمدنی کا نصف حصہ تھا، اس بوجہ کے ہلکا کرنے کے لیے مختلف
 تدبیریں اختیار کی گئیں۔ انہی میں سے ایک یہ تھی کہ کچھ لوگ اس پر آمادہ ہوئے کہ اگر گورنمنٹ
 ہم کو بحر جنوبی میں کامل حقوق کے ساتھ تجارت کرنے کے لیے ایک کمپنی قائم کرنے کی
 منظوری دیدے تو ہم قومی قرضہ کے سود کی ادائیگی کے لیے آٹھ لاکھ سالانہ دینے کے علاوہ
 ایک گران قدر رقم سر دست پیش کرتے ہیں یہ اسکیم منظور کر لی گئی اس کمپنی کے منتظمین نے
 حصہ خریدنے والوں کی کشش و میلان کے لیے بیشتر کر دیا کہ بحر جنوبی کے جزائر میں سونے
 کی بدولت بڑی دولت ہاتھ آئی ہو، پھر کیا تھا، لوگ حصوں کے خرید کے لیے دیوانے
 ہو گئے اور ہزار ہزار پونڈ تک کے حصہ خرید لیے گئے، کیونکہ ہر شخص چاہتا تھا کہ کسی آسان
 اور فوری طریقہ سے محنت و مشقت کے بغیر دیرپہ لمبے لیکن ہو یہ رہا تھا کہ ارباب اسکیم
 تجارت تو کم کرتے تھے اور کچھ سے زیادہ اڑاتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ دفعہ سلسلہ میں سارا بھاڑا
 پھوٹ گیا، ہزاروں شرکات تباہ ہو گئے، بیسکڑوں آدمی بے خانما ہو کر ترک وطن پر مجبور ہوئے،
 اُس کے ماسوا عام طور پر ہر طرف لوگوں میں عیاشی، بد اخلاقی، اور بددیانتی پھیلی ہوئی تھی،
 محنت و جفا کشی سے روزی پیدا کرنے کی قابلیت مفقود تھی۔

بریکلے نرا فلسفی نہ تھا، اس کا دال بای جنس اور قوم و ملت کے درد سے لبریز تھا

شورش و تباہ کاری کا یہ نظردیکھ کر اُس سے نہ رہا گیا، اور برطانیہ عظمیٰ کو بروادی سے بچانے کی راہ کے عنوان سے ایک مبسوط رسالہ لکھ کر گننام شائع کیا۔ اس میں اُس نے بتلایا کہ برطانیہ کی تباہی کے اصلی اسباب الحاد و بددینی کی اشاعت، عیاشی، فضول خرچی اور کابل و جوی ہیں۔ بحر جنوبی کی ناکامی کی نہ میں ہی اسباب پہنچاؤں اس لیے ”اگر ہم اپنی نجات چاہتے ہیں تو ہم کو دیندار، میانہ رو، اور جفاکش بننا چاہیے۔ اُس نے اس میں اقتصادی ترقی و منزل کے اس نکتہ سے نہایت وضاحت کے ساتھ آگاہ کیا کہ ”جس قدر کسی قوم میں بغیر ہنر و جفاکشی کے دولت کمانے کے طریقے رائج ہونگے، اُسی قدر اُس میں اُن دونوں (ہنر و جفاکشی) چیزوں کی کمی ہوگی“ اُس نے اپنے ان عادی کو یونان، اور روم کی تاریخی مثالوں، اور ہالینڈ، اسپین، پرتگال وغیرہ کی زندہ شہادتوں سے (جو اُس زمانہ میں صنعتی و تجارتی ترقیات کے لحاظ سے یورپ میں ممتاز تھے) واضح کیا ہے۔

بازگشت وطن | چند ہی مہینے لندن میں گزرنے پائے تھے کہ آئرلینڈ جانیکی ایک عمدہ تقریب پیدا ہو گئی، ۹ سال سے باہر تھا، احباب دیارِ ان وطن سے ملنے کا قدرۃ اشتیاق بڑھ گیا۔ ۱۸ اگست ۱۸۸۵ء میں گریفٹن کاڈوک ثانی چارلس آئرلینڈ کا لارڈ لٹفٹ یا دایسرے مقر ہو کر جا رہا تھا، ہر کھلے کو ارل برنگٹن کی سفارش سے اس نے اپنا چیلپلین بنا کر ہمراہ لے لیا۔ یہاں ڈبلن یونیورسٹی کے ارباب نے ٹریفٹی کالج کے اس سرمایہ فخر پرانے معلم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور متعدد تعلیمی و دینی مناسب پراس کا یہیم فقر عمل میں آتا رہا، جبکہ اُس نے تقریباً ڈھائی سال تک انجام دیا، تفصیل یہ ہے۔

سینئر فیلو تو پہلے ہی سے تھا۔ ۱۴ نومبر ۱۸۸۵ء کو یونیورسٹی کی جانب سے دینیات کے پچھلے اور ڈاکٹر کی ڈگری عطا کی گئی۔ ۲۰۰ کو دینیات کا لکچرر اور یونیورسٹی و اعظم بنا لیا گیا۔

۳۱ جون ۱۸۵۲ء کو عمری لکچر کی جگہ خالی ہوئی، اُس پر بھی اسی کا انتخاب عمل میں آیا۔ نوبر مین
 سینئر پراکٹر (مہتمم یا نگران) کی انتظامی خدمت سپرد ہوئی۔ ان تمام خدمات کا معاوضہ چار
 پانچ سو پاؤنڈ سالانہ اندازہ کیا جاتا ہے، ساتھ والیسراے (لارڈ چارلس کا بیٹا) مین
 بھی رہا جس کا کام ایسا نہ تھا، کہ ان نئے فرائض سے عہدہ برائی میں خارج ہوتا۔

بے سان دگمان دولت ۱۸۵۲ء کے نصف اول میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جسے
 ڈاکٹر برکلے کے حالات اور ارادوں میں بہت کچھ تنیر پیدا کر دیا ہوگا۔ ایسٹمہر جو
 دانیومری نام ایک دولت مند تاجر کی لڑکی تھی۔ اُس کے مان باپ مرچیکے تھے۔ تنہا تمام
 جائیداد کی مالک تھی، کہا جاتا ہے کہ سوفٹ کے اُس کے ساتھ کچھ عجیب پراسرار تعلقات
 تھے، اور اس خاتون نے اپنی تمام کائنات اُس کے حوالہ کر دینے کا عزم کر لیا تھا لیکن
 اُس نے نہایت شرمناک غذا رانہ سلوک کیا جس سے اُس کا دل بھٹ گیا۔ اور اسی ۱۸۵۲ء میں
 مرتے وقت اس نے اپنی تمام جائیداد کی وصیت ہمارے برکلے اور ایک اور شخص رابرٹ رائل
 کے نام کر دی۔ کل مالیت آٹھ ہزار پاؤنڈ کی تھی جس میں یہ دونوں نصف نصف کے
 شریک تھے۔ برکلے سلسلہ میں جب لندن میں تھا، تو سوفٹ کے ساتھ صرف ایک مرتبہ ٹھہر
 ہاں ڈنر میں شریک ہوا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ بس یہی پہلا اور آخری موقع ہے کہ برکلے
 نے ایسٹمہر کو دیکھا تھا۔ لہذا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ برکلے کو اس خبر سے کس قدر اچنبھا ہوا ہوگا
 قیاس یہ کیا گیا ہے کہ اس کی دلکش اخلاقی شخصیت کا یہ ایک کرشمہ تھا کچھ زیادہ حیرت انگیز
 نہیں ہے کہ جو شخص اولین ملاقات میں شب ابھر بری کو فرشتہ مجسم نظر آیا ہو، اُس نے
 چند ہی گھنٹوں کی کج بائی میں ایسٹمہر کو ہمیشہ کے لیے گرویدہ و مسحور کر لیا۔

ڈبیری کی ڈبیری اس واقعہ کے تقریباً سال بھر بعد ڈیوک آف گریفٹن کی سرپرستی اور قدرانی

کی بدولت ۲ مئی ۱۸۷۲ء کو ڈاکٹر برکلی ڈیربی کی دولت مند ڈیربی کیلئے نامزد ہوا، ڈیربی
یون بھی ایک نہایت دقیق کلیسا کی انصاف پسند شخصیت سے صرف ایک درجہ نیچے ہے۔
لیکن ڈیربی کی ڈیربی خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی تھی۔ اور اس زمانہ میں آئرلینڈ
کے چرچ کا ایک نہایت ممتاز اور بزرگ عہدہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی آمدنی گیارہ سو
پانچ سو کے قریب تھی۔ اسی عہدہ کی ۱۹ کو اس رتبہ دین پر اسکی جانشینی کی باقاعدہ رسم ادا
کی گئی۔ یہ جگہ چونکہ خود اپنے مستقل مشاغل و فرائض رکھتی تھی اس لیے کالج سے فیلوشپ اور
لکچرری وغیرہ کے عالمانہ تعلقات اس کو قطع کرنے پڑے۔

جزائر برمودا میں کالج ابھی ڈاکٹر برکلی کو ڈیربی برکلی بنے شکل سے چار مہینے گزرے تھے
قائم کرنے کی اسکیم کہ یکایک سو فٹ کے ایک خط سے ہموارہ خبر ملتی ہو کہ وہ امریکہ کے
باشندوں اور شہریوں کی تعلیم کے لیے جزائر برمودا میں ایک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالنا چاہتا
ہو۔ اس شخص کی تکمیل کا اس نے غیر متزلزل عزم کر لیا ہو، اور اس کے لیے وہ اس
درجہ بے محل ہے کہ "اگر ڈیربی سے اس کو بسکدوش نہ کر دیا گیا تو اس کا جگہ نشین ہو چکا"
سوفٹ کا یہ خط جسکی تاریخ ۳ ستمبر ۱۸۷۲ء ہے، آئرلینڈ کے موجودہ وائسرائے کے نام ہے، جس
میں اس سے سفارش کی گئی ہے کہ برکلی کو اس کے اس مقصد میں مدد دے برکلی کے
مرتبہ ڈیوٹ آف گریفٹن کی وائسرائے کا زمانہ مئی ہی میں اس کو ڈیربی بنانے کے بعد
ختم ہو چکا تھا۔

سوفٹ کے اسی خط میں تصریح ہے کہ برمودا میں کالج قائم کرنے کا تخیل آج سے
تین سال پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا۔ یعنی جب وہ اٹلی کے سفر سے واپس کر لندن میں مقیم
تھا، اور بحر جنوبی کا فتنہ بالکل تازہ تھا۔ اس کے تباہ کارانہ عواقب اور انگلستان کی عام

مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی اتری کا جو شدید اثر پڑا اور اس انگیزہ اثر برکے کے دل پر پڑا تھا، اس کا اندازہ
 تم اس رسالہ سے کر سکتے ہو، جو برطانیہ غلطے کو بربادی سے بچانے کے لیے اس نے لکھا تھا۔
 اس بنا پر یہ بات قرین قیاس ہے کہ سرزمین وطن کی اصلاح و نجات سے ایوس ہو کر علم و
 مذہب کی خدمت کے لیے نئی دنیا (امریکہ) کی بن جتنی لیکن صالح زمین پر اس کی نگاہ انتخاب
 پڑی ہوگی جیسا کہ خود اسکی ایک نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”میوز (علم و فن کی دیوی) انگریز زمین (انگلستان)
 سے بیزا رہ کر ایک بعید خطہ ارض (امریکہ) میں زمین عہد کے لیے چشم برہ ہر جہان کی آب ہوا
 دلکش ہے، جو خصوصیت کا تخت گاہ ہے، جہاں قدرت رہتا اور نیکی حکمران ہے، لیکن ایک
 ایک گرہ اب بھی نہیں کھلی، کہ آخر یہ تخیل تین سال تک کبوں سو یا رہا ہمارا قیاس ہے کہ اس
 ہم کو سر کرنے کے لیے برکے نے اپنے لیے دو باتوں کو اڑس ضروری خیال کیا ہوگا، اولاً وجہ
 محاش سے اطمینان دے، فکری ثنائیا کسی ایسے موثر کلیسیائی مرتبہ کا حصول جو اس کی آواز
 کو حکومت کے ایوان اور قوم کے مختلف طبقات میں زیادہ موثر اور دو قیاس کے اب فی فزون
 شرطین مجتمع ہو چکی تھیں پہلی ایسٹھر کی وصیت کی بدولت اور دوسری ڈیمری کے منصب جلیل سے
 بہرہ کیف، کچھ بھی ہو، ڈیسن برکے کو اپنے اس سہ سالہ خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے
 ستمبر ۱۸۲۲ء میں ہم پھر لندن میں باتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس
 اسکیم کے اغراض و مقاصد کو مفصلاً شائع کیا۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی مقصد
 تو امریکہ کے وحشی باشندوں میں مسیحیت کی تبلیغ اور علم و تمدن کی اشاعت ہے، اگرچہ اس
 غرض کے لیے اس صدی کے آغاز ہی سے مختلف مالک و یورپ سے مشن بھیجے جا رہے تھے
 اور ان میں اسی کام کے لیے امریکہ میں ایک مستقل جمعیت کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی،

لیکن اب تک جس طرح کے مشنری بھیجے جاتے تھے وہ چونکہ نہایت کم علم و کم حوصلہ ہوتے تھے، ان کے اندر ملت اور انسانیت کی خدمت کے ایثار اور جوش و ولولہ کا فقدان ہوتا تھا، اس لیے وہ اپنی شکم پروری اور تن آسانوں میں پھنس جاتے تھے برکلے کے نزدیک کامیاب اور مستقیم راہ عمل یہ تھی، کہ سب سے اول ایک کالج بنایا جائے جس میں تن دہی سے کام کرنے والے مبلغین امریکہ کے حالات و ضروریات کے مناسب تیار کیے جائیں اور سب سے بڑھکر اس امر کی کوشش کی جائے کہ خود وہ ان کے باشندے اس کالج میں تعلیم حاصل کر کے اپنے ہوطنوں کو خود ان کی زبان میں علم و مذہب کے نجات بخش اصول سے آگاہ کریں، جو بہت زیادہ سریع و تاثیر طریقہ ہے۔

فلاسفہ کی نسبت یہ عام بگمائی ہے، کہ بے شک وہ عالم سماوی کے دقائق و غوامض کی ایسی پراسرار داستان بیان کر سکتے ہیں کہ معمولی لوگوں کی عقلیں بگم جاتی ہیں لیکن عالم ارضی کے کاروبار میں ان کے ذہن نشین بالکل نہیں چلتے فلسفی کے ایک محدود معنی میں یہ بگمائی بالکل بے بنیاد نہیں ہے، لیکن برمودا اسکیم کے مجوز فلسفی کا دامن کمال قطعاً اس نقص سے پاک ہے۔ اس دعویٰ کی شہادت کے لیے اس تجویز پروردگار کے ایک بند کا اقتباس کافی ہے، جس میں اُس نے بتلایا ہے کہ قیام کالج کے لیے کیسی جگہ ہونی چاہیے

”و انتخاب مقام میں بہت سی باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ آبنے ہوا عمدہ ہو“

کھانے پینے کی چیزیں سستی اور بافراط ہوں، امریکہ اور جزائر کے تمام

حصوں سے تعلق قائم رکھنا آسان ہو۔ بحری قزاقوں و شیون اور دوسرے

دشمنوں سے بے خوف و محفوظ ہو، تجارت کی منڈی ہو، کہ کالج کے طلبہ

اور فیملی اپنا اصل کام چھوڑ کر تاجر بننے کے حربوں میں جا لیں، وہ ان ملک کی

بنات اچھیں پرتی کا چرچا نہو کہ ان کا دھیان اُچٹا جائے اور انکی انہماک
 میں کمی واقع ہو، یا انکو اپنی سادگی اور متوسط زندگی سے غیر مطمئن اور بے عزت
 بنائے۔ سب سے آخریہ کہ وہ ان کے باشندے بشرطیکہ ایسی کوئی
 جگہ مل سکے، اپنے عادات کی سادگی اور معصومیت کے لحاظ سے ممتاز
 ہوں، محکومہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ یہ نکتہ فوجوان طلبہ کے اخلاق
 کے سوار نے میں کس قدر اہم ثابت ہوگا، اور شن پر کتنا زبردست
 اثر اس کا پڑے گا۔

اس کے بعد اُس نے تفصیل دار بتلایا کہ یہ تمام خصوصیات جزائر برمودا میں مجتمع
 ہیں۔ قارہ امریکہ سے نیویسٹل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا مجمع الجزائر ہے جو جنوبی
 بحر اٹلانٹک میں واقع ہے، کہنے کو تو اس میں ۳۰۰ کے قریب جزیرے شامل ہیں لیکن
 کل رقبہ ۱۰ میل مربع سے زیادہ نہیں، اب وہاں کے لحاظ سے اُن کو سدا بہار کہا جاتا ہے۔
 اس اسکیم کا لندن کے بعض مغز حلقوں میں نہایت پر جوش استقبال کیا گیا، کچھ
 چندہ بھی فراہم ہوا، لیکن برکلے کو یہ دھن تھی کہ گورنمنٹ سے کوئی گران قدر امداد، اور
 شاہی چارٹر ملے، اُن کے مقصد کے حصول کے لیے اُس نے دوڑ دھوپ کا کوئی طریقہ اُٹھا
 نہیں رکھا۔ علمی مشاغل اور فلسفیانہ غور و فکر تک کو بالابے طاق رکھ دیا، دربارداریاں
 کیں۔ کارولین، شہزادی دیس، کو علمی و مذہبی صحبتوں اور مناظروں سے بے حد شوق تھا،
 اُس نے ایک ہفتہ وار مجلس قائم کر رکھی تھی، جس میں برکلے کو سمول کلازک کا، جو اب تک
 زندہ تھا، حریف بنکر جانا پڑا تھا۔

این ہم اندر عاشقی بالابے غمہاے دگر

بالآخر سنی سہ مین بیڑا پار لگا، چارٹر کے ساتھ بیس ہزار پونڈ کا وعدہ گورنمنٹ نے کر لیا
کانج کا نام سینٹ پال کانج قرار پایا۔ خود برکے پہلا پریسڈنٹ مقرر ہوا، احمدی
اور مناصب متعین ہو گئے، مقاصد کا اعلان کر دیا گیا۔

اس کے بعد دو برس سے زائد برکے اور لندن ہی میں رہا۔ اس زمانہ کے
بہت سے خطوط جو ڈیرٹام کے نام لکھے گئے تھے محفوظ ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے
کہ آئرلینڈ میں اسکی جائیداد وغیرہ کی دیکھ بھال اور تمام معاملات ٹام ہی کے سپرد ہیں۔
جائیداد کے جھگڑے اب تک چلے آتے ہیں۔ مرحومہ کے قرض خواہ لندن میں برکے
کو آ کر دق کرتے ہیں۔ دوسرا شریک معاملات کو صاف نہیں ہونے دیتا۔ آخر میں
اُس نے تنگ آ کر لکھا ہے کہ دکلا سے مشورہ کر کے تنہا میرے حصہ پر قرض وغیرہ کا
جو کچھ بار پڑتا ہو، وہ جلد سے جلد چکا دیا جائے۔ اپنے بھائیوں کو ٹام سے اکثر وپیہ کی
دہنید کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تعلیم وغیرہ کا پورا کفیل ہے۔

شادی | ۵ ستمبر ۱۸۷۲ء کے خط سے دفعۃً ہکو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ہمارے برمودا یونیورسٹی
کے پریسڈنٹ نے شادی کر لی۔ اور کل مع اپنی بی بی اور تمام جماعت کے جزیرہ
رہوٹو کے لیے پابہ رکاب ہے۔ افسوس ہے کہ شادی کے محرکات وغیرہ کے متعلق اس
سے زیادہ کچھ نہیں معلوم، جتنا اس خط میں دیا ہوا ہے۔ "میری شادی مرحوم جیمس
فورسٹر کی لڑکی سے ہو گئی، جس کا مزاج اور طبیعت کی افتاد ان تمام چیزوں سے زیادہ
میرے لیے دلکش ہے، جو میں اُسکے سارے بچنس طبقہ میں پاتا ہوں" چونکہ برکے
خود برمودا کو کاروبار کے شور و غل سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، اس لیے اُس نے
یہ قارہ امریکہ سے بہ نسبت برمودا کے بہت قریب ہے۔ کوئی ڈیرہ سویل کے فاصلہ پر ہو گا۔

مناسب یہ خیال کیا رہو ڈمین ایک جائیداد خرید کر وہاں کچھ تجارت اور صنعت کے پیشہ وروں کو آباد کر کے بروڈا سے لین دین اور آمد و رفت کے تعلقات قائم کر دے تاکہ کالج کے ضروریات سے یہاں سے مہیا ہوتے رہیں، اسی غرض سے اس نے اپنے ہمراہ بہت سے تجارت پیشہ اور صنایع لے لیے۔ اس کے علاوہ اور مختلف قسم کا بہت سا سامان ساتھ تھا۔ بیس ہزار کتا بون کا وسیع ذخیرہ تنہا برکے کی ملکیت کا جواز تھا۔

جزیرہ رہوڈ | غرض اس اہتمام اور ساز و سامان کے ساتھ ۲۹^{۲۹} کے پہلے مہینے کی ۲۲

کو رہوڈ کے بندرگاہ نیوپورٹ پر برکے کا ۲۵۰ ٹن کا جہاز لنگر انداز ہوا۔ یہاں نیوپورٹ میں یہ ۵۰-۶۰ مہینے رہا۔ اس کا حسن خلق، مذہبی بے تعصبی و تحمل اس قدر مشہور ہو گیا تھا کہ ہر مذہب و فرقہ کے لوگ کثرت سے اُس کے دغظون میں شریک ہوتے تھے۔ یہ کبھی کبھی یہاں کے باشندوں اور دیہاتیوں کے جھوٹے روں میں اُن کے عادات و خیال کے مطالعہ کے لیے بھی نکل جایا کرتا تھا۔ اصل بری امریکہ غالباً ایک آدھ بار سے زیادہ جانے کی نوبت نہیں آئی۔ یہ جگہ اس کو اتنی بھائی، کہ ۱۲ جون کے خط میں ٹام کو لکھا ہے کہ اگر چارٹر میں تغیر ہو سکے، تو میں اس جگہ کو بروڈا سے زیادہ پسند کروں گا۔ اسی خط میں خبر دی ہے کہ ”بسرے لڑکا ہوا ہے، جو خدا کا شکر ہے کہ جینے والا معلوم ہوتا ہے“

دہاٹ ہال | جولائی یا اگست میں برکے رہوڈ کی اصل دادی میں منتقل ہو گیا، یہاں اس نے

ایک وسیع قطعہ زمین خرید کر اچھا خاصا مکان بنالیا جس کا نام شاہان انگلستان کے قصر کی یادگار میں دہاٹ ہال رکھا۔ اس کے آثار شاید اب تک موجود ہوں، یہاں اس کے دو سال انتہائی اطمینان و سکون کے ساتھ بسر ہوئے ہونگے، مکالمات اسپتارن انہی پراسن ابام کی یادگار ہیں، یہاں کے باشندے بیان کرتے ہیں کہ وہ اکثر پہاڑی

کے ایک کھوہ میں کھلی ہوا میں ٹپک رہی سیفان کے لیے مطالعہ کیا کرتا تھا اس کتاب میں جا بجا بیان کے مناظر بھی ملتے ہیں۔ دہارٹ ہال میں قرار گیر ہونے کے بعد اُس نے نیو پورٹ میں ایک فلسفیانہ مجلس قائم کی، جہاں کچھ لوگ اُس کو اپنے مذاق کے زندہ کھٹنے کے لیے ملجاتے تھے، سال میں دو بار اُس کے مکان پر گرد و نواح کے مشنریوں کا اجتماع ہوتا تھا، جو اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کے لیے باہم گفتگو و تبادلہ خیالات کرتے تھے، اور برکے کے قیمتی مشورہ سے مستفید ہوتے تھے، امریکہ کا مشہور عالم و حکم سیمول جانسن نے جو آگے چل کر نیویارک کے کنگ کالج کا پہلا پریسیڈنٹ ہوا، کسی بار دہارٹ ہال کا حج کیا، برکے سے تلمذانہ استفادہ کرتا تھا، اسکے فلسفہ کا پوری طرح قائل ہو گیا تھا، اکثر اپنے شکوک اور علمی دشواریوں کو مرسلت کے ذریعہ سے رفع و اصل کیا کرتا تھا، چنانچہ اسکے نام برکے کے جو خطوط ملتے ہیں وہ تمام تراسی قسم کے مباحث سے لبریز ہیں، کہا جاتا ہے کہ جانسن کی مشہور تصانیف برکے ہی کے خوانِ علم کی زلہ راہبان ہیں، امریکہ کے اور علمائے اہلیات میں بھی مبادی کا فلسفہ بہت مقبول ہوا جتنا تھن اڈورڈ سنی جو سنیانہ کا نہایت دقیق النظر عالم فلسفہ خیال کیا جاتا ہے۔ برکے ہی کی آواز باز گشت ہے۔

لیکن ان تمام مصروفیتوں اور دلچسپیوں کے باوجود ہمارے ڈوین کلاسار دل اپنی اسکیم پر مودامین لگا ہوا ہے، لندن کے احباب کو براہِ لکھتا رہتا ہے کہ سرکاری عطیہ وغیرہ کے حصول میں جلدی کرنی چاہیے، اس کو کیا معلوم تھا کہ اس کی زندگی کا یہ ڈراما ٹریجڈی ہی ثابت ہوگا، سب سے پہلے غالباً ۱۸۷۷ء کے آخر ہی میں اُس کو لندن کے ایک دوست نے خط میں اشارتاً اتنا لکھا تھا کہ بیس ہزار پاؤنڈ والے وعدہ کی محکو بہت کم توقع ہے، اس یاس انگیز اطلاع کا غالباً کوئی دیر با اثر نہ پڑا ہو۔ لیکن سال بھر سوزاؤ

کے سپہ سالار اور انتظار کے بعد باج ستمبر میں پراگ کو جو خط لکھا ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس پر بھی یاس چھا چلی ہے، چنانچہ لکھتا ہے کہ "باوجود اپنے مقاصد میں تاخیر اور مایوسیوں کے خدا کا شکر ہے کہ تسکین کے لیے دونوں راجتین حاصل ہیں، ایک میری بی بی، اور ایک بچہ، جو ہر طرح میری توقعات سے بڑھ کر، اور میری آرزوؤں کے عین مطابق ہے۔" اسی خط میں لکھا ہے کہ میرے حساب میں میری بی بی کی دایہ کی لڑکی کی پرورش کے لیے دو گنی سالانہ میری بی بی کی بھادج کو دیا کرنا ایک جان کو کار خیر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی فیاضی اور غیر می بھائی بندوں ہی تک محدود نہ تھی، پھر، مئی کے خط میں ہر طرح کی کوششیں کر تھکنے کے بعد لکھتا ہے کہ "صاف صاف لکھ رہی جواب لجانے کے بعد میں وطن کی مراجعت کا قطعی تہیہ کر لیا ہے۔ کیونکہ اس کو میں ذرا بھی اپنے ذہن میں جگہ نہیں دے سکتا کہ باہرہ کر ڈیرمی کے تعلق کو قائم رکھوں۔" یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ یہ اپنے منصب ڈیرمی سے علیحدہ نہیں کیا گیا تھا۔

بالآخر غالباً ۱۸۳۷ء کے آغاز میں لندن کے بشپ گلسن نے بہ ہزار خرابی وزیر اعظم ڈالپول سے یہ دلچسپ اور آخری جواب حاصل کیا "اگر آپ مجھ سے بہ حیثیت میرے وزیر ہونے کے دریافت کرتے ہیں، تو میں یقین دلاتا ہوں کہ جیسے ہی سبک مصلحت موقعہ دیگی قطعاً روپیہ دیا جائیگا، لیکن اگر آپ بہ حیثیت دوست کے یہ پوچھتے ہیں کہ ان میں سے باؤنٹ کے انتظار میں ڈین برکلے کو امریکہ میں پڑا رہنا چاہیے یا نہیں، تو میرا دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے توقعات کو خیر باد کہہ وطن واپس آجائیں۔" یہ ستم ظریفانہ جواب تو ہمارے ڈین کو وسط اپریل سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ لیکن ستمبر سے پہلے وہ سواحل امریکا کو نہیں چھوڑ سکا، خدمت مذہب و انسانیت کے اُس خرمین صد شوق و آرزو کے ساتھ جو دس سال سے

فرہم کیا جا رہا تھا، وزیر اعظم برطانیہ کے ان فقرات نے جس برق انگنی کا سلوک کیا ہوگا
ہم اس کا کسی طرح اندازہ نہیں کر سکتے سچ یہ ہو کہ بریکے کی تقریباً ہفتاد سالہ زندگی کا
کوئی ساختہ اتنا درد انگیز اور دل خراش نہیں ہو گا ناگون رحمت کشیوں، مالی نقصانات
اور اضاعتِ وقت کے بعد اُس کے پاس اگر تسکین اندوزی کا کوئی سرمایہ تھا، تو مکالمات
السیفارن، اور وہاٹسٹ ہال کے وہ پراسن و با فراغت ایام جو اُس نے دنیا کی پُر
زندگی، اور کشاکش سے آزاد رہ کر فکر و مطالعہ کی عالم فراوش ذہنی لذتوں میں بسر کیے،
جس کا اظہار اُس نے السیفارن کی پہلی ہی گفتگو میں کیا ہے، حکیم عرفی نے سچ کہا ہے کہ
نقد ہر سود و حسیب زیان انداختیم

لندن واپس بہر کیف ساڑھے تین سال کی غیبت کے بعد فروری ۱۹۳۲ء میں ہم
ڈین بریکے کو مع بی بی اور بچے کے لندن میں پاتے ہیں، جہاں دو سال سے زیادہ قیام
رہا، مابچ میں مکالمات السیفارن کا پہلا ایڈیشن، جس کے ساتھ نظریہ رویت بھی شامل
تھا، نکلا، اُس میں انھیں دعبیانِ آزاد خیالی کے مقابل میں مسیحیت بازمہب کی حمایت
کی گئی ہو، جبکہ ذکر مضامین گارجین کے ذیل میں اوپر گزر چکا ہے، اس قدر جلد ہاتھوں
ہاتھ بیک میں پھیل گئی کہ اسی سال دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا، لیکن اس کتاب کی
اشاعت نے بریکے کی مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا، کثرت سے لوگوں نے تردید میں
چھاپیں۔ بشپ براؤن نے جبر السیفارن میں بعض بعض جگہ حملہ تھا، ایک نہایت ضخیم
کتاب لکھ ڈالی، جس کے تقریباً دو سو صفحے صرف بریکے کی تردید کے لیے وقف کر دیے،
لیکن اُس نے اس تمام طوفان میں صرف اس ایک گنام مراسلہ کی جانب اکتفا کیا جو
روزانہ اخبار ڈیلی پوسٹ ہوا سے میں نکلا، اور جس کا تعلق نظریہ رویت سے تھا۔

اس خلافت عادت اعتنا کا سبب برکے نے خود ہی جانسن کے ایک خط میں بیان کیا ہے
 بنسپت کارک کی کتاب بارودہ دوسری کتاب جس کا مصنف سیکسٹر نامی کوئی شخص ہر انکی جانب
 بیان لوگوں نے بہت ہی کم التفات کیا ہوا اس لیے میں نے پہلک میں ان پر کوئی توجہ نہیں
 کی جن اعتراضات کا جواب اصل کتاب میں دیا جا چکا ہوا ان کا بھر جواب دینا اور ایک
 ہی بات کو بار بار دہرانا غیر ضروری اور نامطبورع دونوں تھانظر یہ رویت والا امر اسلہ اگر
 اخبار میں نہ چھپتا، جسکی وجہ سے تمام ملک میں پھیل گیا، تو میں اس پر بھی توجہ نہ کرتا، اسکے علاوہ
 نظریہ رویت بعض آدمیوں کے لیے کسی قدر گنجشک بھی تھی، اس ایک موقع پا کر اُسکی
 تشریح کر دینا چکونا گوار نہیں گزرا، اس جواب کا عنوان "تشریح و اثبات نظریہ رویت" تھا،
 آرزو سے غزل | اے ہو ڈسے واپس ہوتے ہی برکے کی تندرستی میں گھن لگ گیا تھا، جس میں
 برمودا اسکیم کی ناکامیوں کا کچھ کم حصہ تھا، تمام کے خط میں لکھتا ہوا کہ "منضبط زندگی اور صبح خیزی
 کی بدولت (جو دنیا میں مجھ کو سب سے عمدہ چیز معلوم ہوتی ہے، بہت کچھ سنبھل گیا ہوں یہاں تک کہ
 گوا بھی پڑھ لکھ نہیں سکتا، لیکن خیالات میں ویسی ہی صفائی آگئی ہے جیسی کبھی پہلے تھی لہذا
 تفریحاً صبح کا وقت ریاضی کے بعض مسائل پر غور و فکر میں گزارتا ہوں، ممکن ہے کچھ نتیجہ نکل آوے"
 یہ نتیجہ اتنا سلیس ہے، جسکا حاصل یہ ہے کہ ریاضی کے اصول اولیہ اور مبادی بھی اسی طرح انسان کے
 لیے ناقابل فہم ہیں جس طرح مذہب کے، لہذا مذہب کو صرف اس بنا پر نہ ماننا کہ اسکے مبادی غنی الفہم
 ہیں، محض ہٹ دھرمی ہے۔ اسکی اشاعت نے انگلستان کے تمام مشاہیر علماء و ریاضیات
 کو نفل بر آتش کر دیا اور میسوں مضامین و رسائل مخالفت میں لکھ ڈالے گئے، ابھی پوری طرح
 سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ نفوس کا حملہ ہوا، جو زندگی کے ساتھ گیا۔ سن بھی انحطاط کا آچکا تھا۔
 ان اسباب غزل و خانہ نشینی کی آرزو غالب کر دی، چنانچہ ۱۵ جنوری ۱۸۷۲ء کے خط میں

ظام کو لکھتا ہو کہ ”اب میرے تمام حوصلوں پر صحت کا خیال اور عزت کی تنہا غالب ہو“
 منصب بشپ | خوش قسمتی دیکھو کہ ۱۹ ہی جنوری کو اس تنہا برآری کا بہترین سامان نکل آیا،
 ڈین برکلے کو یکا یک یہ اطلاع ملی کہ وہ کلاٹن کا بشپ برکلے ہو گیا، یہ جگہ اُس کی
 گوشہ نشینی کے اعمال کے لیے اتنی موزون تھی کہ وہ خود بھی اس سے بہترین تجویز
 کر سکتا تھا، اور حکومت نے اس ذریعہ سے ایک حد تک ہرمودا کی مایوسیوں کی شکست فاش
 کر دی، لیکن خرابی صحت کی وجہ سے مئی سے پہلے برکلے لندن کو نہ چھوڑ سکا۔

عہد انحطاط و عزت

(۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۷ء)

۱۹ مئی ۱۹۳۲ء کو دن سینٹ پال چرچ (ڈبلن) میں بشپ کے مقدس منصب پر برکلے
 کی سرفرازی کے باقاعدہ تمام مراسم ادا کیے گئے، یہاں ہفتہ عشرہ ٹھہر کر اُس نے سیدھی کلاٹن
 کی راہ لی، یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جسکی ابریشیہ (بشپ کا ماتحت حلقہ) میں ۴۴ گرجے اور ۱۱۰۰
 پیرسٹنٹ آبادی شامل تھی، روٹن کیتھلک چرچ دو گئے تھے، اور ان کی آبادی بھی ۸۰ ہزار
 زائد تھی، خود بشپ کا اقامت گاہ کلاٹن کے دیہات میں واقع تھا، جو خاموش مطالعہ اور عزت
 کی زندگی کے لیے ہر لحاظ سے موزون تھا۔ برکلے یہاں پہنچ کر بالکل خانہ نشین ہو گیا، ۱۸۰۱
 سال کی طویل مدت میں کل ایک بار ۱۹۳۷ء میں اپنی ابریشیہ سے باہر قدم نکالا، وہ بھی
 صرف ڈبلن تک اور ایک مذہبی فتنہ کے فرد کرنے کے لیے (جس کا ذکر آگے آتا ہے) کلیسیائی
 فرائض کی انجام دہی کے علاوہ ابتدا میں صبح کے اوقات کا بڑا حصہ فلاطون اور ہورکے

۱۹۵۳ء تا ۱۹۶۰ء کی مشہور کتاب ”سیاستِ مذہب“ ہے، برکلے اُس زمانہ میں یونانی خیالات خصوصاً فلاطون

کا شیدائی ہو رہا تھا۔ ہورکے لٹریچر کی جان بھی یہی یونانی خیالات ہیں اس لیے غالباً وہ برکلے کو مغرب راہ ہو گا۔

کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا، انالسٹ کی اشاعت کے علماء ریاضیات میں جو آگ لگ گئی تھی اسکے شعلے اب تک جا بجاسے اٹھ رہے تھے، ڈاکٹر جوردن نامی ایک مشہور شخص نے اسکا رد لکھا، ڈولین کے ایک اور عالم ریاضیات والٹن نے بھی اس پر شدید حملے کیے، برکلی نے ان دونوں کا جواب دو مستقل رسالوں میں دیا، جو دلائل کی قوت کے ساتھ نہایت شوخ چوٹوں کی چاشنی بھی رکھتے ہیں۔

خدمت وطن | سسل بیمار یون اور علی زندگی کی ماسیون نے برکلی کو خانہ نشین بیشک کر دیا تھا، لیکن جس شخص نے ملت انسانیت کی خدمت کے پیچھے گھبرا، احباب اعزہ سکو بچ کر نئی دنیا کا ایک گوشہ جا بسایا تھا، اسکی خانہ نشینی کے یہ معنی کسی طرح نہیں ہو سکتے تھے کہ وطن میں رہ کر اہل وطن کی تباہ کاریوں کا تماشا بیٹھے بیٹھے دیکھا کرے اُس زمانہ میں آئر لینڈ کی اجتماعی اور عمرانی حالت نہایت ہی پست تھی معاشرت کے ادنیٰ ادنیٰ اصول سے یہاں کے باشندے بیگانہ تھے، مذہبی اور اخلاقی تفریق اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا مختصر یہ کہ زندگی کا ہر پہلو محتاج اصلاح و تجدید تھا، خود برکلی جانسن کو ایک خط میں لکھا ہرگز مادی اور روحانی دونوں حیثیات سے کاخیر کے لیے یہاں نیا انگلینڈ (امریکہ) سے دس گئے زائد مواقع موجود ہیں۔

لازمہ کی روک تھام | برکلی نے ان تمام حالات کا نہایت تعمق سے مطالعہ کر کے سب سے اول تفریق کے اسباب اور وسائل اصلاح کا استقصا کیا، اور دو برس تک پیہم اپنے خیالات کو مختلف عنوانات سے ملک کے سامنے پیش کرتا رہا، مذہب سے عام بے التفاتی اور بد دینی کی روز افزوں اشاعت کی جانب ارباب حکومت کو توجہ دلائی، اور یہ دکھایا کہ مذہبی عقائد و خیالات کا انسان کی زندگی اور اعمال پر نہایت عظیم الشان اثر پڑتا ہے، آدمی کا چال

چلن اس کے عقائد ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے مذہب اخلاق کے اُن عقائد کی حفاظت، جو
 بدکاری سے بچاتے اور نیکو کاری کی طرف مائل کرتے ہیں، حکومت کا اولین فرض ہے، کسی
 حکمران کا یہ کہنا کہ لوگوں کے اعتقادات سے بحث نہیں، میں صرف انکے اعمال کی پردہ
 کرتا ہوں، اپنی کمزوری کا اظہار ہے، ڈوبن میں ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی، جو فسق و فجور اور دنیا
 زندہ کی علانیہ تعلیم دیتی تھی، انتہا یہ کہ اسی کام کے لیے ایک باقاعدہ سوسائٹی بن گئی تھی، سبک نے
 ان شیاطین کی صرف تحریری پردہ درمی پر قناعت نہیں کی بلکہ ڈوبن جا کر کئی عینے قیام کیا،
 لارڈ بشپ کی حیثیت سے دارالامراء کے متعدد اجلاسوں میں شریک ہو کر ان کے خلاف نہایت
 پرزور تقریریں کیں، نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ کو ایک کمیشن بٹھانا پڑا، جسکی تحقیقات عجیب و غریب قابل
 اعادہ ابلیس کاریوں کا انکشاف ہوا، اور بالآخر ان معین فسق و فجور کو اپنے کردار کی فرار و قبی
 پا دہش بھگتنا پڑی۔

اقتصادی اصلاحات | بے شک ایک ایسی جمعیت کی بچکانی جسکے وجود کی غایت ہی تعلیم فسق و فجور
 نہایت عظیم مذہبی اصلاحی فرض تھا۔ لیکن برکلے ہمارے آجکل کے مولویوں کی طرح زراں نہ تھا،
 کہ چند بد زبان ملاحظہ کے خلاف صرف تقریر و تحریر یا حکومت کے زور سرائیکی زبانوں کا بند کرنا ہی
 دینی خدمات کی معالج سمجھتا۔ وہ ابنائے وطن کی عمرانی و اقتصادی فلاح اور انکی دائمی فلاح کو بھی
 اصلاح کے نہایت اعمال میں داخل جانتا تھا، چنانچہ اُسے مستفسر (LURIST) کے نام سے
 ایک سلسلہ شروع کیا، جو ۳۳ء سے ۳۵ء تک تین قسطوں میں شائع ہوا۔ اس میں اُسے استفسارات
 کے پیرایہ میں تمام ان دقائق اقتصادیات کی تعلیم کی ہر جو آج فلسفہ معیشت یا علم الاقتصاد
 کے بنیادی اصول ہیں۔ مل نے بعض استفسارات کی نسبت لکھا ہے کہ اگر برکلے اس نظریہ

کی تکمیل کر دیتا تو آج آدم اسٹیج کا پیشرو ہوتا، اتنا ہی نہیں بلکہ نہایت گوش و جان فنانی سے اُسے اپنے عہد کے تمام ترقی یافتہ ممالک کی صنعت و تجارت کے اعداد و شمار ہتیا کیے ہیں اور ایک ایک کمرے بتلایا ہے کہ آئرلینڈ کی درآمد و برآمد کیا ہے، اُس پر بیرونی تجارت کا کتنا تسلط ہے، سیکڑوں مصنوعات جو اجنبی ممالک کے بازاروں سے حاصل کیے جاتے ہیں خود وطن ہی میں تیار کیے جاسکتے ہیں۔ یہ اعداد و تحقیقات اب کچھ زیادہ مکمل کام نہیں ہوتا، لیکن دوسو برس پہلے اتنا آسان نہ تھا۔

”ستفہ“ یہ استفسارات اگرچہ اٹھارھویں صدی میں حکومت و باشندگان آئرلینڈ کو مخاطب کر کے لکھے گئے تھے۔ لیکن ان کا اکثر حصہ آج بیسویں صدی میں ہندوستان کے حالات کے اعتبار سے مطابق ہو کر صرف نام کے بدل دینے کی ضرورت ہے، اس ۵۰-۶۰ صفحہ کے مختصر مجموعہ میں ہمارے ملک کے فذا نیان وطن اور عیان ملت پرستی خصوصاً مسلمانوں کے لیے بیسویں اسباق و بصائر و ودیعت ہیں، افسوس ہو کہ ان استفسارات پر کوئی البیڈ بحث و تبصرہ زیر تحریر نہ کرنا کے موضوع سے خارج ہو پھر بھی چند اقتباسات درج کیے بغیر کسی طرح آگے نہیں بڑھا جاتا۔

۲۲- کیا تھوڑا رویہ جو کاروبار میں لگ کر حکم کھاتا رہتا ہے نتیجہ میں اس کثیر رویہ کے مساوی ہر جگہ کی گردش سست ہوتی ہے؟

۲۳- کیا رویہ کی اہل حقیقت صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ ایک طرح کا مکٹ یا شمارندہ ہو؟ ذیل میں کچھ دقتیں نکلتے ہیں۔

۴۲- اگر دولت کا حقیقی سرچشمہ محنت ہو تو کیا ایک عقل مند حکومت کا فرض نہیں ہے کہ ہر ایک کے اسباب و مرکبے؟

۵۳- مجرموں کو امریکہ وغیرہ جلا وطن کر دینے کے بجائے کیا کوئی ایسی بیرونین نکال جاسکتی ہے کہ وہ فائدہ عام کے لیے مفید بنائے جاسکیں؟

۵۶۔ کیا یہ صحیح ہے کہ بالیدین غربا کے لیے اپنی محنت و مشقت کے سوا کوئی اور سہارا نہیں ہے اور پھر بھی ان کی

گلیوں میں کوئی گد کر نہیں ملتا۔؟

۵۷۔ کیا وہ شخص جسکی عیش پرستی بیرونی مصنوعات کو محض کرنی چلی جاتی ہے اور جسکی جفاکشی بدلے کوئی

دیسی صنعت مہیا نہیں کرتی، ملک کے لیے ایک عذاب نہیں ہے۔؟

۶۵۔ اگر فرانس اور فلینڈرس میں منقش ریشمی مصنوعات لیس وغیرہ کی تعلیم کے لیے مدارس ہوتے

تو کیا پھر وہ بھی انگلستان سے اتنا روپیہ کھینچ سکتے تھے؟

۶۹۔ کیا فرش و فروش بنانے سے جلد تر کوئی صنعت سیکھی جاسکتی ہے؟ اور کیا ہمارے عورتیں تھوڑی

مدت اور زحمت میں ان سے زیادہ خوبصورت دری قالین وغیرہ نہیں بنا سکتیں جو ترکی سر کرتے ہیں؟

۱۰۴۔ جو لوگ اجنبی ممالک کے مشروبات کا استعمال کرتے ہیں اور وہ ان کے سامان آرائش سے بے نیاز کچن کے

آراستہ کرتے ہیں کیا وہ اس کے مستوجب نہیں ہیں کہ ان کا شمار اجانب میں ہو؟

۱۰۸۔ کیا ہم اس فیشن پرستی کی بدولت تباہ نہیں ہو رہے ہیں جو کسی اور قوم کے لیے زیادہ ہے اور یہ غفلت

قوم کے لیے دولت مند قوم کی نقالی جنوں نہیں ہے؟

۱۶۹۔ کیا ملک اس حال میں نہ بپ سکتا ہے کہ ہمارے ہاں کا گوشت تو بام بھج بجا جاتا ہے اور خود ہمارے

مزدور آلودن پر زندہ رہتے ہیں؟

۲۱۷۔ کیا دولت مندی کا ایک حقیقی اساس جفاکشی اور میانہ روی کے سوا اور کچھ ہے؟ کیا جفاکشی اور جوہر

ذاتی کے علاوہ تحصیل دولت کے اور تمام وسائل کا سد باب نہ کر دینا چاہیے؟

۲۴۸۔ کیا مذہبی آزادی خدائی کے موضوع کو بالائے طاق نہ کر دینا چاہیے؟ اور کیا ہمارے آزاد خیالوں کے

لیے اب وقت نہیں آگیا ہے کہ اپنے تمام انکار کو ملکی ترقی کے نیچے منہمک کر دیں؟

۳۲۶۔ کیا ہمارے اس جزیرہ کے لیے یہ بہتر نہ ہوتا کہ عیش پرست اور دوسا جہاز میں ٹھاکر جنسی مالک

میں بھیج دیے جائیں اور وہیں رہیں بجائے اسکے کہ وطن میں رہ کر اپنی ملک و سامانی تعیش پر اپنی

ریاستیں برادر کریں اور ہر مرض تمام سرزمینِ وطن میں متعدی ہو؟

۳۶۔ کیا لیڈروں اور وطن پرستوں کے لیے ایسے زیادہ کوئی شکرستوجبِ طاقت ہو سکتی ہو کہ کوگون کو روزگار میسر

نہ آتا ہو؟ اور کیا ایسے وسائل نہیں اختیار کیے جاسکتے، جنہے لنگڑے، لولے، اندھے اور بہرے تک

بے روزگار نہ رہ سکیں اور صناعی کی کسی نہ کسی شاخ سے اپنی روزی حاصل کر سکیں؟

۵۱۵۔ کیا ایک ایسا بین الاقوامی سرٹ سوئی کپڑوں کی بدولت اسپین سے آٹھ ملین سالانہ نہیں گھٹتا تھا؟

۵۱۸۔ کیا قریباً ۴۰ سال پہلے سپین کو سوئی کپڑوں کی تجارت میں ہمارا بھی مقول حصہ تھا؟ کس چیز نے اسکو فنا کیا؟

مقالہ بنام حکام وغیرہ مقالہ بنام حکام اور اصول و طہنیت وغیرہ کے مختلف عنوانات سے برکتے نے اس قسم

کی سبق آموز تحریری خدات اور تنبیہات کا سلسلہ کچھ نہ کچھ آخر دم تک جاری رکھا، اکثر اسکے مقولے فطرت بشری

کی رزنا نامی جگہ سے ملوہوتے ہیں وہ جانتا ہو کہ کوئی بشر بشر رہ کر اپنی ذاتی بھلائی یا اغوائیں سر قطع نظر

نہیں کر سکتا، اس لیے وہ اصول و طہنیت میں حقیقی وطن پرست کی پہچان یہ بتلاتا ہو کہ

۲۷۔ وطن پرست اپنی ذاتی فلاح کو رفاہ عام کے اندلش کرتا ہو لیکن ایک خود پرست ہمارا رفاہ عام کو اپنی

ذاتی اغوائیں کا غلام اور ماتحت قرار دیتا ہو۔ اول الذکر اپنی حیثیت ایک کل کی چیز کی سمجھتا ہو اور آخر الذکر

خود اپنے ہی کو کل سمجھتا ہو؟

رمون کی تھلک پادریوں کے نام ایک اپیل شائع کیا ہو، حسین اُن سے درخواست کی ہو کہ اپنی جماعت

کو محنت و مشقت کا عادی بنائیں اور محبوبیتِ نفرت لائیں اسکے لیے طرح طرح کے موثر اسالیب کام لیا ہو۔

ساری کائنات فطرت کا ہون کے خلاف دلائل و اشارات سے پر ہو، سلیمان نے فرمایا کہ ادب و جوانی

اور جونیٹ کی کو دیکھ "جونیٹ، ماکھی (BEETLE) اور تمام حشرات الارض پر ہر ماکھی کی جیسی نسبت

مشہور ہو کہ دوسروں کی مشقت سے پیٹ پالتا ہو، انسان کے لیے جانشینی کی اسباق کی کتابیں.....

بس جب کاہل آدمی کسی مصرت کا نہیں تو مصرت کا کوئی حق نہیں سنجیدہ
فرمان ہر لوگوں سے کہو کہ کام کریں اور اپنی کمائی کی روٹی کھائیں گداہی کی روٹی نہیں
دوسروں کے پسینہ کی کمائی ہوتی روٹی نہیں بلکہ خود اپنی روٹی جو اپنی مشقت سے پیدا ہوتی
ہو،.....“

یقیناً بونا جو تباہی کا ایسی درزش ہو جسکی لطف بخشی نفع بخشی سے کم نہیں ہر کچھ شکار
کو اپنے جھوپڑے سے نکال کر تازہ ہوا اور کھلے میدان میں لیجاتی ہو جسکی بدلت اسکی قسمت اُس
بھول آدمی سے بہت زیادہ قابل رشک بنجاتی ہو جو پیال پر پڑا رہتا ہر اداں بھراگ کے
باس لیٹا رہتا ہو“

ایک آکرش جب کام کرتا ہوتا ہو تو حالت یہ ہوتی ہو کہ جان کوئی گٹھی یا گھٹیا پاس
سے نکلا تو وہ قطعاً اپنا کام بند کر دیکھا اور جیتا نہ آنکھ سے اچھل نہو جائے کھڑا ہو کر دیکھتا ہو کہ کیا ایک
ٹروٹی لندن سے برٹل ہمارے سفر میں اسکو محسوس کیا کہ جس مژدے سے اسنے دریافت کرتا تھا وہاں اور کچھ
اور کام کا ہرج کیے جو اب تھا، بخرا ایک کے کہ اپنی کدال کے سہلے کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا اور یہ ایک آکرش
”مقالہ بنام حکام“ میں حکومت کے فرائض اور تعلیم کے صحیح معیار کی نسبت لکھتا ہو کہ
انسان ایک ایسا حیوان ہے جسکی عقل جذبات و فرائض و فرائض کی نسبت لکھتا ہو کہ
آبادہ کرتے ہیں اور عقل انکے حصول کی تدبیریں سکھاتی ہو اس آکرش حیوان کو پالا اور خرمنانا
عدل اور سیکو کا ہی کا ملکہ پیدا کرنا اُس کو بذریعہ توحیف بری ہونے سے دور رکھنا اور میدان کے
ذریعہ سے اجبات کی سرانجامی میں اسکی ہمت بڑھانا غصہ کی اسکو سہاگنی کے قابل اور اہل دنیا بھی
سیاسی اور مذہبی تعلیمات کا مقصد اور نہرمانہ کے حکم اور صلیح کی مساعی سمجھتی ہو اس مقصد کے حصول کا
موزوں ترین نظام ہمیشہ صحیح تعلیم سمجھا گیا ہے“

انسان کے اعمال اس پر عید روز یا ہر کہ انسان کے اعمال اخلاق بہت کچھ اسکے خیالات عقائد اور سوچ کے خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں نتیجہ ہوتے ہیں ایسے صحیح اور مفید عقادات کا پھیلانا اور ان کی حفاظت حکومت کا سب سے بڑا فرض ہے

”انسانی حالات کی نوعیت ہی ایسی واقع ہوئی ہو کہ یہ تو قطعا ناممکن ہے کہ تمام عوام الناس فیہن تمام چیزیں کو ان کے علل و خالق کی بنا پر جاننے لگیں ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ ایک نو کاڈار کو اپنا حساب کے لیے ایک ملاح کو جہاز رانی کے لیے، ایک نجار کو کلوڑی کی پیمائش کیلئے صرف ایک منہ سے مٹے قواصا CONCLUSION) ہی کافی ہوتے ہیں ان میں سے کوئی شخص اصول یا نظریات جیسی جسامتیں

کے سبانی دلائل کو نہیں سمجھتا یہی حال اخلاقی سیاسی اور مذہبی حالات میں بھی ہوتا ہے ایک بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ جو عقائد و خیالات ابتدائے عمر میں آغا زِ فہم کے ساتھ ہی نہیں بٹھادیے جاتے ہیں بے اسکے کہ انکی اصل حکمت کی ادنیٰ جھلک بٹھکھائی جائے، وہ بھی عمدہ نتائج پیدا کرتے ہیں اور دنیا کے لیے نہایت ہی مفید ثابت ہوتے ہیں حقیقت یہ شخص برگرد ویش کے روزانہ مشاہدات رکھیں ہو سکتی ہے ”جو خیالات شروع ہمایں، اہم ہستہ ذہن میں داخل کر دیے جاتے ہیں وہ سب پھیلا پانا شروع کرتے

ہیں اور بڑھ کر پکڑ جاتے ہیں پھر اس حد تک کہ وہ انسانی افعال کا حقیقت سب بڑا حصہ بن آئے بلکہ بالعموم انسان کی زندگی کو سر تاپا اپنے زمانہ میں نگہ لیتے ہیں انسان کے افعال کے اصلی محرکات و

غوت اور قوت نہیں ہیں بلکہ وہ خیالات جو ان چیزوں کی نسبت اسکے دلیں قائم ہو گئے ہیں لہذا کسی محسوس کا یہ کہنا کہ ”کچھ مضائقہ نہیں لوگ جس قسم کے خیالات چاہیں رکھیں، حکومت صرف ان کے افعال سے سروکار ہو، اسکی کمزوری کی دلیل ہو، کیونکہ آدمی کے جیسے خیالات ہوتے ہیں دیے ہی اسکے افعال ہونگے“

ایک تین نکتہ جس جملہ کو، اوپر کی عبارت میں ہم نے خط زدہ کر دیا ہے اس میں جو نکتہ برکت کے قلم سے نکل گیا ہے، اسکی قدر کسی دقیق نظر عالم نفسیات اور فطرت بشر کی رز شناس سے پوچھیے

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ انسان طرح طرح کی عیاریاں اور عرق سیز کو شنشین بالوچہ کی طلب میں کرتا ہے
لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل محرک یہ خیال ہے جو کسی کے دل میں اُلجھا دے کہ تیری کی نسبت بیگیا ہے
چنانچہ اگر کسی کے ذہن میں عزت و ثروت کی وقعت نہ ہو تو اس کی طلب کے پیچھے کبھی جان نہ دیگا۔
لیکن تم جانتے ہو کہ ہر کلمے ہماری قومی مجالس کے اسٹیج کا تماشا گاہ نہیں تھا کہ صرف
باتیں بنا کر تسکین و فحاشی حاصل کر لیتا۔ وہ جو کچھ کہتا تھا خود بھی اس عمل کی کوشش کرتا تھا۔

صنعت و حرفت کی علامت افزائی، حیرت اور استعجاب کی حد نہیں رہتی کہ ایک فلسفی اور مذہبی
سوت کا کارخانہ مصنوعات اور پیداوار کی ترویج و بہت افزائی کے لیے خود ہی سن کی کا

کرتا تھا اور سوت بنانے کے لیے ایک بڑا کارخانہ کھول رکھتا تھا، باوجود نفاست پسندی کے وطن ہی کی
بنی ہوئی تیری بھلی چیزوں کو استعمال کرتا تھا اور بیرونی مصنوعات سے انقطاع کر لیا تھا صنعت و حرفت
کی ترقی کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کی جانب اتنی توجہ تھی کہ کہا جاتا ہے کہ آئرن لیڈ میں سیتھی اور مصوری
بریکے ہی کے گھر سے راج پذیر ہوئی اس کا مکان دار الفنون (آرٹ گالری) تھا، ہفتہ وار سیتھی
کی ایک بزم سکے ہاں منعقد ہوتی تھی جس میں محلہ کے لوگ بھی مدعو ہوتے تھے اپنے بچوں کو سیتھی
سکھلانے کے لیے اطالوی ماسٹر نوکر رکھتا تھا خود مصوری وغیرہ کا نادانہ ذوق رکھتا تھا ماسٹر نوکر
نے کچھ تصویریں بھیجیں تو اُن پر تنقید کرتا ہے تیسری تصویر نقلی اور بزرگ ہے۔۔۔۔۔
عورت والی تصویر اچھی نہیں ہے لیکن اطالوی قلم کی ہمارت و حسن کو نہیں پہنچی۔۔۔۔۔

جن ساعی میں دماغ و دل، ہاتھ اور قلم سب برابر کے شریک ہوں وہ رابگان کیسے جاتی ہیں
چنانچہ اس صدی کے وسط میں آئرن لیڈ کے حالات میں عظیم تغیر ہو گیا، اور آج اس میں بین کی
جدوجہد کی جو گرم بازاری ہے اس میں ہمارے لارڈ بشپ اور مستفسر کے مصنف کا کم حصہ نہیں ہے
تخط و بابا ۳۹ کے آخر میں اتنا شدید لاپرواہی کہ دریا جم گئے، جسکی بدولت لازماً قحط پڑا اور اسیا شدہ

پڑا کہ گھوٹوں کا نرخ ۴۲ شلنگ فی کلوڑکن تک پہنچ گیا، جو پھر کمین دو برس بعد جا کر ۱۶ شلنگ پر
 اترا، ہزاروں آدمی فاقے سے مر گئے، ساتھی اسہال دم اور دہانی بخارا اس لمبے کے تمام مقامات
 میں پھیل گیا جو سالہا سال تباہی کا باعث رہا، تم سمجھ سکتے ہو کہ اس انسانی مصیبت میں اپنا حصے جس کے
 اس ہمدرد پر کیا گذرتی ہوگی جو اپنے سے زیادہ دوسروں کے لیے زندہ تھا، اس نے اپنے آرام و آسائش
 کی چیزیں ترک کر دیں۔ ہر دو شنبہ کی صبح میں باؤٹ کلاٹن کے محتاجوں کو نقد تقسیم کرتا تھا، باوجود
 سے کھانا بٹاتا تھا، بے روزگاروں کو روزی سے لگانے کے لیے خود ہی زراعت شروع کر دی، ایک خط
 میں لکھتا ہے کہ اس انتہائی پُر آشوب زمانے میں ہم روزانہ سو سے زیادہ آدمی کھیتی باڑی کے کسی کسی کام
 میں بھیسے رکھتے ہیں، جسکی دیکھ بھال میری بیوی کرتی ہے، یہ ایک منفعت بخش کار خیر ہے۔
 طبی تحقیقات اس اسہال دم اور بخار کی وجہ سے شپ فلسفی کی زندگی کا ایک بہت ہی عجیب و غریب
 ماہ القیر ^{مستقل} ہمارے لیے چھوڑا ہے، بریکلے جب ایک مین تھا تو وہ ان اس نے دکھا کہ چیچک غیر کے بعض امراض
 میں لوگ ماہ القیر ^{مستقل} ڈاؤنڈر استعمال کرتے ہیں، آرلینڈ مین جو وقت بانی بیمار یا بھیلینڈ کو سکود فٹہ
 خیال آیا کہ یہاں بھی اس کا تجربہ کیوں نہ کیا جائے۔ اس میں بعض احباب نے بھی ساتھ دیا، چنانچہ ماہ القیر کا
 امراض میں تجربہ کیا گیا اور خاطر خواہ کامیابی ہوئی، یہاں تک کہ بریکلے کو اس بات کا قطعی یقین ہو گیا کہ ماہ القیر
 میں کوئی غیر معمولی عنصر حیات شامل ہے اور یہ تمام امراض کے لیے اکیس ثابت ہو کر ہیکٹا چار پانچ سالہ
 دھن میں لگا رہا اور بالآخر سنہ ۱۸۷۰ء میں ایک ضخیم کتاب اسی موضوع پر لکھ دی جس کا نام ماہ القیر کے فوائد فلسفیانہ
 تفصیلات و تحقیقات اور بعض دوسرے باہم پوسٹہ مباحث کا ایک سلسلہ تھا، اس کتاب کی اشاعت کا عالم
 ہوا کہ چند ہی مہینے کے اندر سرس کے نام سے دوسرا ایڈیشن نکلا، فرانسیسی جبرسن، برنگالی وغیرہ متعدد
 زبانوں میں ترجمے شائع ہو گئے، لندن میں ماہ القیر کے کارخانہ کھل گئے، پیشہ ور اطباء کے دل میں رقابت
 کی آگ لگ گئی اور انھوں نے اس کمین زیادہ مخالفت کا طوفان برپا کر دیا، جتنا انا لٹ کی اشاعت

کے وقت علمائے ریاضی نے کیا تھا۔ لیکن اس خاصیت نے سرس کی اشاعت قبول میں اور زیادہ مدد دی (اس کتاب کا تفصیلی ذکر تصانیف کے ذیل میں آگے آتا ہے)۔ ایام عربیت کے آخری ۱۰، ۱۲ سال کا بیشتر حصہ اسی بار الفیر کی تحقیقات اور مریضوں کے علاج و معالجہ میں گذرا، اگست ۱۹ء کے ایک خط میں لکھا ہے کہ ”مار الفیر کے استعمال کرنے والے مریضوں کی مراسلت نے احباب سے مراسلت میں غیر منضبط بنا دیا ہے اور اکثر تاخیر ہو جاتی ہے۔“

قناعت خود داری | ۱۴۵ء میں آئرلینڈ کے جدید اشراف نے برکے کی ان بے لاگ وطنی اور دینی خدمات کا اسطرح اعتراف کرنا چاہا کہ کلاٹن کے بجائے کلوگر کے بپشپ کا منصب پیش کیا، جس میں مالی منافع بہت زیادہ تھے، لیکن ملک قناعت کے بادشاہ کے لیے یہ ترغیب کیا حقیقت رکھتی تھی اس نے صاف انکار کر دیا، کچھ دنوں بعد آرج بپشپ کی جگہ خالی ہوئی جو مناصب کلیسائی کی معراج کمال ہے، احباب نے شدید اصرار کیا کہ وہ اسکے لیے اپنے کو پیش کرے مگر اسکی خود داری اور بے نیازی نے صرف یہ جواب دیا کہ ”میں تو آرج بپشپ کی نام کی عزت کا بھوکا ہوں نہ دولت کا طالب ہوں جسکو لندن کا ہر دوکاندار حاصل کر سکتا ہے۔“

اولاد کی تعلیم و تربیت | برکے کی ان مختلف اہمات مصروفیتوں سے خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر خود کوئی توجہ نہ کر سکتا ہوگا۔ معمولی والدین کی طرح بچوں کو محض کسی اسکول کے ”مزدور معلمین“ پر چھوڑ دیا ہوگا، یا زیادہ سے زیادہ گھر پر کوئی بڑا بڑا رکھ دیا ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس عظیم پدری فرض کی نہ صرف ہمیت کا صحیح احساس رکھتا تھا، بلکہ ضعیف العمری اور دائم المرضی کی معذوریوں پر بھی اُس نے اسکی ادائیگی میں کبھی غفلت یا تقصیر نہیں کی جبکہ انما ذہن خود اس کی بیوی کے ایک خط سے کر سکتے ہو جو اُس نے شوہر کی موت کے بعد اپنے لڑکے کے خارج کو لکھا ہے:-

”تھالے پیارے باپ کی دانائی اور ایمان کی خبر گیری نے، کیسی ہوشیاری اور احتیاط تھا۔
 بچپن کو سنبھالا۔ اپنے آرام کے لیے ہنسنے کو کبھی مزدور تعلیم کے اٹھون میں نہیں چھوڑا۔
 میں تم خود اپنے باپ سے تعلیم پاتے تھے، وہ گو ضعیف العمر اور دائم المرض تھے، لیکن فطرت
 کو خود ہی انجام دیتے تھے، اور کسی دوسرے پر اسکو چھوڑنا نہیں دیا تھا، تم انکی مشغولیت
 اور سرت تھے، کوتاہ نظر لوگ تعلیم کی معمولی اور ادنیٰ الغرضوں کو خطرناک نہیں سمجھتے، لیکن وہ
 جانتے تھے کہ بنیادی غرضوں کا کبھی علاج نہیں ہو سکتا، اور کو پہلے ہی بسا دینا بعد کو
 شراب میں خوشبو پیدا کرنا ہر اسی لیے اٹھون نے تحفظ کو علاج پر ترجیح دی، جہاں تک ممکن تھا
 تھا وہ تم کو یاد دلانے پاس رکھتے تھے یا اکیلا۔۔۔۔۔ ان کا خود شراب سے اجتناب تھا، لیے اسے
 کہیں بہتر سبق تھا کہ وہ تم کو زبان سے دیتے۔۔۔۔۔ تم نے کبھی ان کو بگڑی سے زبان آلودہ
 کرنے نہ سنا ہوگا۔۔۔ خصوصاً اتنا نرم مزاج، ضعیف صابر اور جفاکش پاتے ہیں کبھی دیکھا ہی نہیں
 بڑے (رٹکے کی موت کا شدید صدمہ) قدرت کی بے رحمی دیکھ کر اس نے ایسی جفا کشاں پرورش کئے سب سے
 پہلے ہی شر کو بڑھے باغبان کے ہاتھ سے پھین لیا یعنی فردری شہ میں برکلے کا سب سے بڑا سب سے
 پیارا ہونہارا اور نو عمر جگر پارہ ولیم نذر اجل ہو گیا۔ ماں باپ کی کمر ٹوٹ گئی۔ برکلے کو اس کا جتنا شدید
 قلق ہوا ہوگا اس کا ضعیف سا اندازہ ذیل کے خطوط سے کرو۔

برین ایک ایسا آدمی تھا جو سیاسی ڈیپٹیوں لوگوں سے لینے چکنے اور ان تمام چیزوں سے جنکو
 دنیا لطف و مسرت کہتی ہے، یکسر دست کش تھا، میرا سراپا ایک نہما سادوست تھا، جسکی
 تعلیم ہمیشہ میری نگاہ کے سامنے ہوتی، جسکی مصوری عجیب و غریب تھی، جسکی موسیقی میں سر
 لیے دلکشی تھی، جسکی زندہ دلی اور خندہ مزاجی میری ہر وقت کی عید تھی، خدا کی مرضی نے
 اسکو مجھ سے لے لیا۔ اسکی خوبون اور صورت شکل، اسکی مصوری اور دینداری، خصوصاً اسکی

مجھے غیر معمولی محبت نے جکڑ بہت ہی زیادہ اُس کا گرویدہ بنا رکھا تھا، میں صرف اس کا عاشق نہ تھا بلکہ اس پر مغر تھا میں نے اپنا دل بید لگا رکھا تھا۔ شاید اس سے بہت زیادہ جتنا اس دنیا کی کسی چیز میں لگانا چاہیے۔

بچپن کے دوست ٹام کا انتقال اسی سال اُس کے بچپن کے رفیق اور عزیز ترین دوست پیارے ٹام "ٹامس پرائمر" کا بھی انتقال ہوا۔ نقرس و قلع و غیرہ کی بیماریاں، نخطاط کا سونے پر پھراپہ ان صدات نے برکلے کو بالکل ہی کمنا چاہیے کہ گرا دیا تھا۔ دینی اور وطنی خدمت کی تاب توانائی نے جواب دیا، اور اب قرب موت کی حقیقی گوشہ نشینی کی آرزو تمام چیزوں پر غالب تھی وصیت تک لکھ رکھی بیشپ کے عہدہ سے استعفا بھیج دیا۔ لیکن منظور نہیں ہوا۔ اور بادشاہ (جارج چہم) کو جب معلوم ہوا کہ کس کا استعفا ہوا تو تصریح کے ساتھ حکم صادر کیا کہ برکلے آخر دم تک بیشپ برکلے ہی رہیگا، البتہ اس پر سے تمام منصبی ذمہ داریاں اٹھالی گئیں۔ اور پورا اختیار دے دیا گیا کہ جہاں اسکی خوشی ہو رہے۔

اکسفورڈ گوبرکلے اب اور تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ لیکن پوری فرائض سے چشم پوشی اب بھی وہ نہیں گوارا کر سکتا تھا، اور اپنے دوسرے بچے جارج کی تعلیم کے خاطر بقیہ ایام زندگی اکسفورڈ یونیورسٹی کے زاویہ میں گزارنے کا فیصلہ کیا کہ اولاد کی تعلیم کم از کم اپنی نگاہ کے سامنے تو ہو۔ لیکن دراصل یہ ارض الموت کی کشش تھی۔ غرض اگست ۱۸۹۷ء میں برکلے اپنی بی بی بی (جولیا) اور جارج کو ساتھ لیکر اکسفورڈ روانہ ہو گیا۔

یہاں لوگوں نے اسکو ہاتھوں ہاتھ لیا ہوگا۔ یونیورسٹی کے حلقہ میں اس کا غیر معمولی احترام کیا جاتا تھا۔ اس کے بعض مصنفات کا ایک مجموعہ اور السیفارن کا میسر ایڈریشن اسی زمانہ میں شائع ہوا۔ یہ علمی دنیا سے اس کا آخری خطاب تھا۔ اکسفورڈ کے عزلت کہہ

میں ابھی ۶ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ داعی اجل نے ہم جنوری ۱۹۵۳ء کو دروازہ کھٹکھٹایا۔ موت! اتوار کا دن تھا، شام کا وقت۔ برکے ایک کوچ پر لیٹا ہوا تھا، بال بچے پاس بیٹھے تھے۔ بی بی تدفین کے وقت کی دعا درود زور سے پڑھ کر سب کو سنا رہی تھی، برکے جا بجا کچھ تنقید تشریح کرتا جاتا تھا۔ اتنے میں جو لیا چائے لیکر گئی تو دیکھا باب سو گیا ہے، لیکن یہ خرمیٰ نیند تھی۔ برکے کے دصلیا کا ایک عجیب جزیہ تھا کہ میری لاش پانچ یا اس سے بھی کچھ زیادہ دن تک لونی بے غسل و کفن انہی کپڑوں اور اسی بستر موت پر بے چھڑے پڑی رہنے دیجائے چنانچہ اس کے مطابق وہ موت کے چھٹے دن کراٹھ چرچ کے احاطہ میں مدفون ہوا،

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اؤنیم تو نے وہ گنجائے گرانمایہ کیا کیے زمین نے بے شک برکے کے جسم خالی کو اپنا پیوند بنالیا، لیکن اسکے کا زاموں سے ہزاروں دل و دماغ قیامت تک زندگی چل کرتے رہیں گے، اس مرنے والے کے زندگی بخش حالات کو اب ہم اسکی بیوہ کے ایک خط (تزییت اولاد کے ذکر میں اسی خط کا ایک ٹکڑا) درج کیا جا چکا ہے، کی چند سطروں کے اور اقتباس پر ختم کرتے ہیں۔ جس سے اسکی سیرت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

”وہ اپنی گفتگو، محبت اور مختلف مشاغل سے گھر کو خوش بنائے رکھتا تھا۔ اسکی سبق آموز گفتگو پر ایک گہرا اور پائدار اثر پڑتا تھا۔۔۔۔۔ وہ کسی دوست کی غلطی یا راز کو کبھی فاش نہیں کرتا تھا۔ اکثر آدمی حد سے دوسروں کی تحقیر لاطائل، بکواس اور بدگوئی کے حریص ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ کسی کو اپنے سے بڑا شاید اپنے برابر بھی نہیں پاتا تھا، اس لیے وہ اسکی چسپائی کو نہ کر سکتا تھا، انسان اشیاء اور کتا بون کے متعلق اسکا علم اتنا وسیع اور عمیق تھا کہ موضوع گفتگو کے لیے اسکو کبھی بغلیں نہیں جھانکنا پڑتی تھیں۔ لیکن بالفرض اگر وہ

اتنا ہی بلید ہوتا ہر جتنا کہ متوقد الذہن تھا تو اُس کا ضمیر اور نیک باطنی اُسکے لبوں کو
 بند رکھتی بجائے اُسکے کہ ان کو کسی بھائی کی توہین اور بدگویی کے لیے کھولے، وہ
 دل اور زبان دونوں کا صاف تھا۔ یہ خوبیاں کچھ وہ ماں کے بیٹ سے ورنہ
 سے زیادہ لیکر نہیں آیا تھا بلکہ خود جیسا کہ وہ کہا کرتا تھا اُسکے اکتاب کا زیادہ
 حصہ تھا۔ وہ بارہ بجے اٹھ کر چراغ جلاتا تھا، اور مطالعہ و عبادت میں مصروف
 ہو جاتا تھا، تواضع، نرمی، صبر، فیاضی، اور لوگوں کی روحانی و جسمانی بہبود کا
 خیال ہی اُس کی تمام کوششوں کا مقصود و احد اور اُسکی زندگی کی مصروفیت تھی۔

تلك اَشَارَاتٌ دَلُّ عَلَيْنَا
 فَاَنْظُرْ وَابْعَدْنَا لِيَاسْتَأْذِنَا

تصنیفات

یوں تو گننے کے لیے، برکے کے نوشتجات، مکاتیب کو چھوڑ کر تیس سے اوپر ہیں جن میں سو اٹھ سو صفحات سے لیکر دو صفحہ تک کی تحریر شامل ہے، لیکن ان سب کو ملا کر بھی صفحات کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے آگے نہیں بڑھتی۔ اور جن چیزوں کو مستقل تصنیف یا کتاب کی حیثیت حاصل ہے، وہ دہ دہل سے زیادہ نہیں۔ اس بنا پر برکے کو ہائس، علی اسپنسر کی طرح ضخیم و کثیر التصانیف مصنفین کے دمرہ میں نہیں شمار کیا جاسکتا ہے، اس نے خود بھی جانسن کو ایک خط میں لکھا ہے کہ ”میں بڑی بڑی جلدیں لکھ کر دنیا میں رحمت میں نہیں ڈالتا چاہتا بلکہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان ارباب فکر و تامل کے لیے اشارات ہیں، جو چیزوں کی ترمین گھسنے کے لیے اپنے اندر جست اور ہمت رکھتے ہیں“ مضامین بحث میں تنوع و تعدد کے لحاظ سے بھی اُسکو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں ہے۔ البتہ مواضع تصنیف میں تباہی کافی ہے۔ یعنی اگر ایک طرف خالص الہیات کے مباحث ہیں، تو دوسری جانب مادہ القیصر کی طبی تحقیقات اور اقتصادیات علمی و فنی کے مسائل ہیں۔ آغاز تصنیف کی تین کتابوں یعنی نظریہ رویت، مبادی، اور مکالمات ہائیس و فلونس کے علاوہ باقی اکثر تحریریں، خصوصاً مکالمات سیفان، سرس، اور مستقر و وسیع النظری کی حیثیت سے نہایت جرت انگیز ہیں۔ قدیم و جدید فلاسفہ، حکماء و مشکلمین میں شاید ہی کوئی رسالہ دائرہ وقفیت سے باہر ہو۔ ماکاب یورپ کی زراعت، تجارت، صنعت و حرفت پر اقتصاد، ای نقطہ نظر سے، اس کو

اس قدر عبور ہو کہ اُس زمانہ میں اس سے زیادہ کا امکان نہ تھا۔
 لیکن برکے کی تصنیفی عظمت کا حقیقی راز ان چیزوں سے ماورا ہے جس شے نے
 برکے کو برکے بنایا، وہ وہ قوتِ انکشافِ اجتہادِ فکر ہے جسکی جھلک اُسکے علمی کارناموں
 کے ایک ایک صفحہ پر موجود ہے، اور جسکی بدولت وہ آج تاریخِ فلسفہ کا نقطہ انقلاب سمجھا جاتا
 ہے۔ اس کا نظریہ جدید، علم النفس کا عصر جدید ہے، اسکی مبادی، الہیات میں نہایت تصویریت
 کی موسس و ترمیم ہے۔ اخلاقیات میں وہ افادیت کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ریاضی
 کے مسلمات تک، جن کو ہر حکیم و فلسفی بے چون و چرا قبول کر لیتا ہے۔ اور جن میں شک و تردید
 سائنس کی رو سے کفر ہے، اس کے مجتہدانہ حلوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔
 سوانح کے ساتھ ہم نے برکے کے تقریباً تمام نوشتجات کا کچھ نہ کچھ ذکر کر دیا ہے، اسکے
 علاوہ چونکہ ہمارا اصل موضوع فلسفہ برکے ہے، اس لیے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم مل میں
 محض اُن کتابوں سے بحث کریں گے جو براہِ راست یا ضمناً فلسفیانہ مصنفات خیال کیے جاتے
 ہیں۔ باقی ڈیماٹو، مکالمات السیفارن اور سرس، صرف ضمنی حیثیت اس بحث کی تحت
 میں آسکتی ہیں۔

اجدید نظریہ رویت

یہ کتاب دراصل برکے کے فلسفہ کی تصویر کا ایک منہج ہے، جو سال کے بعد مبادی
 کے صفحات پر اپنے تمام خدوخال کے ساتھ نمودار ہوئی، اور جسکا ماحصل یہ تھا کہ کسی شے کا
 وادراک ہی اس کا حقیقی وجود ہے، کسی شے میں چیز کا نفس مدبرک اور اس کا اس کے لئے ذہن
 ہے دکھو عنوان فلسفہ تصویریت سے دیکھو ذہن السیفارن

سے الگ اور باہر وجود ماننا ایک صریحی تناقض ہے، لہذا سب مقدم کام یہ تھا کہ نہایت وضاحت و تفصیل کے ساتھ اس بات کو طے کر دیا جائے کہ محسوسات کے خارج اند ذہن موجود ہونے کا اعتقاد کیونکر پیدا ہوتا ہے، اور خود خارج کی کیا ماہیت ہے۔

مکو بہت ذرا سا غور کرنے سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ اس اعتقاد کا دار و مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ ہم کو اپنے محسوسات عیناً ذہن سے الگ اور خارج میں دکھائی دیتے ہیں۔ ہم آنکھ کھول لیتے ہیں، تو مکان، درخت، حیوانات وغیرہ اپنی ذات سے مختلف فاصلوں پر نظر آتے ہیں۔ ان چیزوں کے مختلف قد و قامت (امتدادات) اور وضع، یعنی جیت، سیدھا، اور الٹا ہونا، یا کسی کا نیچے ہونا، کسی کا اوپر کسی کا داہنے کسی کا بائیں۔ یہ تمام باتیں کھلم کھلا آنکھ سے نظر آتی ہیں۔ اس لیے گویا اشیاء کا وجود خارجی ایک مٹی حقیقت ہے جس کا کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس اعتراض کی اہمیت کے برعکس اچھی طرح خبردار تھا اس لیے اپنا اصلی فلسفہ پیش کرنے سے پہلے اس عالمگیر غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے اسے نظریہ روت پر قلم اٹھایا، جس کا موضوع بحث خود اسی کے الفاظ میں یہ ہے: ”میرا مقصد یہ بتلانا ہے کہ خیر و کئے فاصلہ (بند)، امتداد اور باہمی وضع کا احساس ہکوحاصل پرلے کے ذریعہ سے کیونکر حاصل ہوتا ہے، نیز اس فرق پر غور کرنا، جو تصورات بصر اور تصورات لمس کے مابین ہے، سا بھی یہ معلوم کرنا کہ کیا کوئی ایسا تصور ہے جو مشترکہ طور پر لمس و بصر دونوں سے محسوس ہوتا ہو؟“ (مبادلہ نظریہ روت)

اس کتاب کے مہماتِ مباحث کی تحلیل جارا جزا میں کی جاسکتی ہے جو کہ وہمِ فیل میں یکجا درج کر کے علی الترتیب بحث کرتے ہیں۔

۱۔ امتداد (طول، عرض، عمق) شکل (مثلث، مربع، مدور، وغیرہ ہونا) حرکت (انتقال مکانی) خارجیت (فاصلہ مکان یا بعد) وضع، فراغت و صلاحیت کے تصورات حاسہ لمس سے حاصل ہوتے ہیں۔

۲۔ حاسہ بصر سے براہ راست وبالہل صرف رنگ و روشنی اور ان کے مراتب مختلفہ کے تصورات کا علم ہوتا ہے۔ امتداد، شکل اور حرکت کے تصورات بھی مرنے لکے جاسکتے ہیں لیکن ان میں اور لمس کے تصورات امتداد، شکل و حرکت میں باہم کسی طرح کی مماثلت نہیں ہوتی، اور ان کا وجود بھی رنگ کی طرح حاسہ بصر سے باہر نہیں ہوتا۔

۳۔ خارجیت یعنی فاصلہ بعد یا مکان کا تصور مطلقاً حاسہ بصر سے نہیں حاصل ہوتا۔ نہ کوئی ایک ہی تصور ایک سے زائد حاسوں سے مشترک محسوس ہو سکتا ہے۔

۴۔ جس بصر ایک طرح کی زبان ہے، جس کے الفاظ (تصورات بصری) اپنے معانی (تصورات لمسی) پر دلالت کرتے رہتے ہیں، اسلافات ذہنی کی بنا پر تصورات بصری سے تصورات لمسی کی جانب اسی طرح بلا شعور ذہن کا انتقال ہو جاتا ہے جس طرح کسی لفظ سے اُس کے معنی کی جانب۔ اور ان دونوں میں کوئی لازمی علاقہ نہیں ہوتا۔

پہلا مقدمہ تو حاسی اور فلسفی سب کے مسلمات میں شامل ہے۔ کون نہیں جانے گا کہ ایک مادرِ داندھا چھو کر چیزوں کی لمبائی، چوڑائی، موٹائی، گولائی وغیرہ کا پتہ لگا لیتا ہے، اس کے جسم پر کوئی کبڑا بیگنا ہے، تو اُسکی حرکت صاف محسوس ہوتی ہے، کسی چیز کو پھونکنے کے لیے اپنے جسم کو حرکت دیکر اس تک پہنچا پڑتا ہے اس حرکت میں ایک زمانہ صرف ہوتا ہے جس سے اس کو چیزوں کے مختلف فاصلوں اور دوری و نزدیکی کا تصور حاصل ہوتا ہے، مکان یا بعد کا تصور بھی اُسی حرکت جسم سے ماخوذ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ اندھا، اپنے سر قدم، مین و بیار،

کی نسبت سے اوضاع کا علم حاصل کرتا ہے مثلاً اس کے سامنے ایک آدمی کھڑا ہے۔ اس کو وہ نیچے سے اوپر تک ٹٹولتا ہے جس سے مختلف لمبی احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا نام سر ہے اور بعض کا پیر جس حصہ کو زمین سے قریب تر پاتا ہے اُس کو نیچے کہتا ہے اور جس کو اس سے بعید تر محسوس کرتا ہے اس کو اوپر کہتا ہے، پھر جب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے تمام اعضائے جسم میں سرزمین سے بعید تر ہے، تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ آدمی سیدھا کھڑا ہے لیکن اگر دفعۃً اس کی آنکھیں کھُل جائیں تو جب تک بصری اور لمبی احساسات کے ساتھ ساتھ تجربات سے استلافات ذہنی نہ پیدا ہو لیں، اُس کو پتہ نہ چلے گا کہ فلاں آدمی سیدھا کھڑا ہے، یا الٹا۔ باقی صلابت و مزاحمت تو کہنا چاہیے کہ لمس کے احساسات مخصوصہ میں ہیں۔ کیونکہ جب کوئی شے ہمارے جسم کو حرکت سے روکتی اور نفوذ سے باز رکھتی ہے، تب ہی ہم کو مزاحمت کا جس ہوتا ہوا در اسی نفوذ کے مختلف مراجع احساسات کا نام صلابت یا رقت ہو۔

دوسرے مقدمہ کے اتنے جز میں تو کسی کو کلام ہی نہیں کہ رنگ اور روشنی بصر کے سوا کسی اور حاسہ سے نہیں محسوس ہونے ساتھی یہ بھی مسلم ہو چکا ہو کہ رنگ و روشنی کا احساس محض ذہنی ہے۔ البتہ یہ امر بحث طلب ہے کہ بصر سے صرف رنگ و روشنی ہی کا احساس ہوتا ہے یا اتنا اد و شکل براہ راست آنکھ سے نہیں محسوس ہوتے یا جو امتداد و شکل مرئی یعنی محسوس بصر ہے وہ اس امتداد و شکل سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا جو چھونے سے حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ کلیۃً ایک ذہنی شے ہے جس کا حاسہ سے باہر وجود نہیں۔ کیونکہ علی العموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو امتداد و شکل چھونے سے محسوس ہوتا ہے وہی بعینہ براہ راست

دکھائی بھی دیتا ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں اور دونوں حقائق خارجی ہیں۔ لیکن
بر کھے صرف لسی امتداد و شکل کو خارجی حقیقت مانتا ہے باقی بصری امتداد و شکل کو اول الذکر
سے بالکل مختلف اور محض ذہنی قرار دیتا ہے۔

ایک ہی شے مختلف فاصلوں اور حالات کے اندر مختلف اشکال و امتدادات
کی نظر آتی ہے۔ مثلاً ہم کو نہایت دور کوئی دھندلی دھندلی شے دکھائی دیتی ہے جسکے
بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آدمی ہے، درخت ہے، جانور ہے، یا کوئی اور شے، جیسا جیسا
ہم اسکے قریب ہوتے جاتے ہیں اس کے امتداد و شکل کے تصورات میں بھی تفاوت
پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ہم اُس کے پاس پہنچ جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے
کہ یہ ایک جانور ہے۔ اب کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس وقت جو قد و قامت یا شکل و
شباہت اس جانور میں نظر آتی ہے وہ وہی ہے، جو پہلے ایک میل کی دوری پر اسکے
بعد کے مختلف فاصلوں سے دکھائی دیتی تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اگر ہماری آنکھوں کی ساخت
کچھ مختلف ہوتی، تو اس وقت پاس کھڑے ہوئے اس جانور کی جو شکل اور قد آنکھ سے محسوس
کر رہے ہیں اس سے بھی بڑا یا چھوٹا نظر آتا، جیسا کہ بعض دوسرے حیوانات کو ایک ہی
فاصلہ سے ایک ہی چیز کا قد اس سے مختلف معلوم ہوتا ہے جیسا انسان کو نظر آتا ہے بلکہ
اگر ہم خود چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو خوردبین وغیرہ آلات کی مدد سے دیکھتے ہیں تو ان کا
امتداد اور ان کی شکل میں اس امتداد و شکل سے زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے جو معمولی
آنکھوں سے محسوس ہونی اُتھی۔ اسی قسم کی بیسیوں اور مثالیں پیش کجا سکتی ہیں جن سے یہ ثابت
ہوتا ہے کہ حالات کے اختلافات سے ایک ہی چیز مختلف امتدادات اور شکلوں کی
دکھائی دیتی ہے۔ اب تم ہی ذرا سوچو بتلاؤ کہ ان سیکڑوں متفاوت اشکال و امتدادات

میں سے کس بنا پر ایک کو حقیقی یا لمسی امتداد و شکل کا مرئی امتنی یا مماثل کہا جاسکتا ہو؟ یہ
 کیسے دعویٰ کیا جاسکتا ہو کہ فلاں شکل و امتداد جس کو ہم دیکھ رہے ہیں، بعینہ وہی ہے جو مجھپونے
 سے محسوس ہوا تھا، پھر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تمام متناقض امتدادات و اشکال جو مختلف
 فاصلوں سے نظر آتے ہیں، سب کی سب کسی ایک شے کے واقعی یا لمسی اشکال و امتدادات
 ہیں، لہذا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن بصری امتدادوں اور شکلوں کا وجود حاسہ بصر یا ذہن
 سے باہر نہیں ہے، اسکے علاوہ اتنا تو تقریباً تمام حکماء و فلاسفہ قبول کرتے ہیں کہ رنگ کا وجود
 ذہن سے باہر نہیں، تو پھر امتداد و شکل جو رنگ ہی کی خاص خاص مقادیر ہیں اور جو رنگ
 سے مجرّد و منفصل وہم میں بھی تخیل نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ذہن سے باہر موجود ہو سکتے ہیں۔
 اصل دھوکا یہ ہے، کہ بلا کسی آلہ کی اعانت کے ایک خاص قربت انسان کو علیٰ اہم
 کسی شے میں جو شکل و امتداد نظر آتا ہے، اس کو وہ غلط فہمی سے واقعی اور خارجی قرار دے
 لیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا کرنا علیٰ زندگی کے کاروبار کے لیے نہ صرف مفید، بلکہ
 ناگزیر تھا، اس لیے ہزاروں سال کے تعصبات و استعمالات کے بعد اب فلسفیانہ حیثیت
 سے بھی اس غلط فہمی کو دور کرنا آسان نہیں ہے، چنانچہ جہاں اکثر علمائے نفسیات و فلاسفہ
 نے برکھ کے اس امکشاف عظیم کو قبول کر لیا ہے، وہاں بہتیرے ایسے بھی ہیں جو آج تک
 مخالف ہیں۔ اس مخالفت جماعت کی جانب سے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں
 بہت زیادہ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ کوئی نہ کوئی امتداد و شکل تو ہم کو آخر محض آنکھ سے
 نظر ہی آتا ہے، خواہ وہ غیر حقیقی ہی کیون نہ ہو۔ لیکن یہ دراصل ایسے لوگوں کا اعتراض ہے
 جنہوں نے خود نظریہ رویت کو کبھی غور سے پڑھنے کی رحمت گوارا نہیں کی، بلکہ اِدھر اُدھر
 سے ایک بات لے اُٹھے، ورنہ اتنا تو خود برکھ نے تسلیم کیا ہے جیسا کہ تم کو ابھی معلوم

ہو چکا ہو کہ ایک طرح کے بصری استدلال شکل کا بھی وجود ہے لیکن وہ حواس بصری ذہن سے
باہر نہیں ہو اور نہ اُس خارجی حقیقی استدلال شکل کے مماثل ہو جو چھوکر محسوس ہوتا ہے
یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ نظریہ رویت میں برکتے محسوسات اِس کو خارجی اور واقعی
مانتا ہے۔ اسی لیے یہ اس کے فلسفہ کا صرف ایک مُرخ یا ایک کڑی ہے۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ چیزوں کے موجود فی الخارج ہونے کا اذعان زیادہ تر باہر
بنی ہو کہ وہ علانیہ ہو کہ مختلف فاصلوں پر نظر آتی ہیں اور یہ فاصلے بالذات مادی یقین
کیے جاتے ہیں۔ لہذا تیسرے دعویٰ کو برکتے کے اصل فلسفہ سے قدر تا زیادہ فرتبی تعلق ہو
اور اسی لیے اُسے علی الاطلاق یہ ثابت کرنا چاہا کہ فاصلہ کسی حیثیت سے بھی محسوس نہیں
بلکہ قطعاً غیر مادی ہے، البتہ گذشتہ تجربات اور استلافات ذہنی کی بنا پر مختلف علام بصری کے
ذریعہ سے مختلف فاصلوں کی طرف نہایت تیزی سے بلا شعور ذہن منتقل ہو جاتا ہے جس سے
ہم کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ خود فاصلہ دکھائی دیتا ہے۔

برکتے نے جس طریقہ سے اس دعویٰ کا اثبات کیا ہو اس کو دراصل تحلیل یا تشریحی
استدلال کہنا چاہیے یعنی افعال ذہن کی تحلیل سے یہ دکھا یا گیا ہے کہ جس چیز کو براہ راست
محسوس بصر خیال کرتے ہو وہ حقیقت میں مکتوب بصر ہے اور ایسے استلافات ذہنی موجود
ہیں جن سے اُسکے مکتوب ہونے کی پوری طرح توجیہ ہو جاتی ہے۔ لہذا اُس کو ایک مستقل
حاصلہ کی جانب منسوب کرنا غیر ضروری اور بے ثبوت بات ہے۔ مل نے تو بیان تک
کہہ دیا کہ جن علامات بصری کی وساطت سے ہم فاصلہ اور بعد کا تصفیہ کرتے ہیں ان کا تعلق
ہمارے اور اوقات فاصلہ کے ساتھ بعینہ اسی قسم کی شہادت پر مبنی ہے جس سے دوسری
چیزوں میں علت و معلول کا علاقت ثابت کیا جاتا ہے۔ یعنی جب علت موجود ہوتی ہے تو

معلول کا بھی ظہور ہوتا ہے؛ جب علت نہیں پائی جاتی تو معلول بھی نہیں متوجہ ہوتا، اور جب علت میں کوئی تغیر واقع ہوتا ہے تو معلول بھی تغیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مثلاً جب ہم کسی چیز کو دور بین سے دیکھتے ہیں تو اس آلہ کا بصری اثر صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز فضا سے رویت کے اُس سے زیادہ صحتہ کو گھیر لیتی ہے، جتنی بے اس آلہ کے گھری ہوئی نظر آتی تھی اور ایسوجہ سے ہم یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اب ہکو یہ چیز پہلے سے بڑی دکھائی دیتی ہے اور چونکہ بڑی دکھائی دیتی ہے اسی لیے پہلے سے قریب نہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ پھر ایک آدھ مثال اور دیکر کہنا ہے کہ ”جب کوئی معیار (علامت) ... نہیں موجود ہوتا تو ہکو مطلقاً مصلہ نہیں دکھائی دیتا۔ مثلاً سماوی اجسام کہ جنکے فاصلوں کے اختلافات کا ہکو کوئی احساس نہیں ہوتا اسی لیے وہ سب کی سب آدمی فاصلہ پر معلوم ہوتے ہیں۔“

اس سے تو کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ زیادہ دور کی چیزوں کے فاصلہ کا اندازہ کیا جاتا ہے وہ جس سے زیادہ اُن علامت سے ماخوذ ہوتا ہے، جنکے اختلافات کا فاصلہ کے قرب و بعد کے اختلافات کے ساتھ ہکو متواتر اور روزانہ تجربہ ہوتا رہتا ہے، ان علامت میں سے ایک کی مثال مل کے اقتباس میں گذر چکی، یعنی مرنی چیز کا کبر و صغر، جس سے علی الترتیب اُس کے قرب و بعد کا ہکو اسی طرح علم ہوتا ہے جس طرح کسی شخص کے چہرہ کی زردی اور سُرخی سے خوف و شرم کا۔ حالانکہ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ہم خوف یا شرم کو بالذات دیکھتے ہیں۔ بعض اور علامت کی مثال سے اس نظریہ کی مزید تکمیل توضیح کے لیے ہم خود برکلی کی عبارت نقل کرتے ہیں۔

”میں ایک چیز کو دیکھتا ہوں جو ایک مخصوص مرنی رنگ و شکل کی نظر آتی ہے، جسکے

ساتھ ایک خاص حد تک دھندلا پن اور بعض اور ایسے حالات بھی شامل ہیں جن سے
 میں اپنے گزشتہ مشاہدات کی بنا پر یہ فیصلہ کر لیتا ہوں کہ اگر میں اتنے قدم باتنے سیل آگے
 بڑھوں تو فلاں فلاں تصورات بس سے متاثر ہوں گا، لہذا حقیقت اور صحیح معنی میں نہ
 تو میں خود فاصلہ کو دیکھتا ہوں اور نہ وہ چیز جسکو ایک خاص فاصلہ پر موجود سمجھتا ہوں.....
 یہ تو خود میرا حال ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ جو شخص بھی خود اپنے خیالات کی توجہ
 سے پر تال کرے گا، اور اس بات کو سوچے گا کہ جب یہ کہنا ہے کہ فلاں چیز جسکو ایک فاصلہ
 دکھائی دیتی ہے، تو اُس کی مراد کیا ہوتی ہے تو وہ مجھ سے اتفاق کرے گا کہ جس شے کو وہ
 دیکھتا ہے وہ صرف اس کے ذہن کو اس جانب منتقل کر دیتی ہے کہ ایک خاص فاصلہ طے
 کرنے کے بعد جو اس وجہ سے کہ اپنے جسم کی حرکت سے ناپتا ہے محسوس ہوتا ہے، وہ ان
 فلاں فلاں بسی تصورات سے دوچار ہوگا، جو فلاں فلاں مرنی تصورات کے ساتھ بالعموم
 وابستہ رہتے ہیں۔

اس اقتباس میں جس علامت کی تشریح ہے وہ چیز دن کا دھندلا پن یا صفائی
 کے ساتھ نظر آتا ہے۔ جن کے مختلف مراتب سے ہم فاصلہ کے تفاوت کا اسطرح قیاسی
 علم حاصل کرتے ہیں جس طرح صغرو کبر سے یعنی جب قدر کوئی چیز دھندلا دکھائی دیتی ہے
 اسی قدر ہم اس کو دور سمجھتے ہیں اور جب قدر صاف ہو اسی قدر قریب خیال کرتے ہیں
 اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ تحلیل اسدلال سے اُسی وقت پوری تشفی حاصل ہوتی ہے
 جب آدمی خود سوچے، اسلئے جیسا کہ برکلی نے کہا ہے تمکو خود غور کرنا چاہیے کہ کس طرح
 علامت بصری سے بالواسطہ فاصلہ کا علم ہو جاتا ہے۔

ادپر کی مثالوں اور تشریحات سے اتنا تو اچھی طرح واضح ہو گیا، کہ زیادہ دور کی چیزوں کے فاصلہ کا اندازہ کسی چیز کی چھوٹائی، بڑائی، دھندھے پن اور صفائی وغیرہ سے کیا جاتا ہے اور وہ بالذات رنگ و روشنی کی طرح آنکھ سے نہیں دکھائی دیتا۔ لہذا کوئی درجہ نہیں کہ قریبی فاصلے بھی اسی قانون کے تحت نہوں، لیکن چونکہ وہ علامت یا نشانات جن سے قریب کی چیزوں کی نزدیکی اور دوری کا ذہن بہتہ لگاتا ہے زیادہ بعید الفاصلہ چیزوں کے علامت سے مختلف اور کسی قدر دقیق ہیں، اس لیے آدمی کو نزدیک کے فاصلوں میں اس امر کا زیادہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ براہ راست رنگ و روشنی کی طرح آنکھ ہی سے نظر آتے ہیں مثلاً ایک شے جو چند قدم یا چند گز کے فاصلہ پر ہے، وہ اگر ایک آدھ قدم یا ایک آدھ گز آگے پیچھے ہٹ جاتی ہے تو بڑائی، چھوٹائی یا صفائی اور دھندھے پن کے لحاظ سے اس میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا، لیکن فاصلہ کی کمی زیادتی کا فوراً ادراک ہو جاتا ہے، جس سے قدرتا ہم کو خیال ہوتا ہے کہ خود فاصلہ دکھائی دے رہا ہے لہذا ہر کلمے نے نہایت دقت نظر سے اُن علامات کا استقصا کیا ہے جن سے نزدیک کی چیزوں کے فاصلہ کا ہم استنباط کرتے ہیں، یہ علامات کل تین ہیں۔

۱۔ جب دونوں آنکھوں سے ہم کسی شے کو دیکھتے ہیں، تو جس قدر یہ ہم سے قریب یا دور ہوتی جاتی ہے، اُسی نسبت سے دونوں بتلیوں کے بیچ کا فاصلہ کم یا زیادہ ہو جاتا ہے بتلیوں کی اس حرکت سے ایک خاص عضل حس پیدا ہوتا ہے جس سے فاصلہ کے تفاوت کا علم حاصل ہوتا رہتا ہے۔

۲۔ جب کسی چیز کو آنکھ سے بہت نزدیک کر لو تو وہ مختل نظر آنے لگتی ہے اور جتنا ہی اُسکو

تربت تر کرتے جاؤ گے اتنا ہی یہ اختلال بڑھتا جائے گا جس سے اور اختلال کے مختلف درجات میں عادتاً ایک علاقہ پیدا ہو جاتا ہے، لہذا جس نسبت سے اختلال زیادہ ہوتا ہے اسی نسبت سے فاصلہ کم محسوس ہوتا ہے اور جب قدر اختلال کم ہوتا ہے یعنی چیز صاف نظر آتی ہے اسی قدر فاصلہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ لیکن ہم اپنی آنکھوں پر ایک حد تک زور دیکر اس اختلال کو کچھ دیر کے لیے روک سکتے ہیں اس حالت میں آنکھوں پر زور دینے سے جو حس پیدا ہوتا ہے وہ اختلال نظر کے حس کا قائم مقام ہو جاتا ہے، اور اُس کے مختلف درجات سے فاصلہ کے تفاوت کا اندازہ ہو جاتا ہے یعنی جتنا ہی زیادہ زور بڑھتا ہے اتنا ہی کم فاصلہ محسوس ہوتا ہے۔ لہذا الگ بالعکس۔

ان سہ گانہ علامت بصری سے فاصلوں کے اختلات و تفاوت کی جانب حسب طرح بالواسطہ ذہن کا انتقال ہوتا رہتا ہے اس کا ہر آدمی بجائے خود تجربہ کر سکتا ہے۔ اور ذرا سی توجہ کے بعد یہ روشن ہو سکتا ہے کہ آنکھ سے انسان کو فاصلہ کا بالکل اسی طرح علم ہوتا ہے جس طرح مکان سے عین اپنے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا ہوں ٹرک سے ایک گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ سنتا ہوں، آواز کے تفاوت سے گاڑی کے مختلف فاصلوں کا بے دیکھے احساس ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح گویا میں فاصلہ کا کان سے بعینہ اسی طرح احساس کرتا ہوں جس طرح آنکھ سے، لیکن با این ہمہ یہ نہیں کہتا کہ میں فاصلہ سن رہا ہوں، جیسا کہ یہ کہتا ہوں کہ فاصلہ دیکھتا ہوں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ محسوساتِ لمس و بصر میں بہ نسبت محسوساتِ لمس و سمع کے، قیاس کا زیادہ موقع ہے۔ لہذا ایک آدمی کو زیادہ سہولت سے یقین آ جاتا ہے کہ اجسام یا خارجی اشیاء صحیح معنی میں سننے کی

چیزیں نہیں ہیں، بلکہ سماعت کی شے صرٹ آواز ہر جگہ کے توسط سے کفلی ص جسم یا فاصلہ کے تصور کی جانب ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ خلاف اس کے بصروں کے تصورات میں جو فرق ہر اس کا تیز کرنا زیادہ دشوار ہے، اگرچہ قطعی ہے، کہ بعینہ ایک ہی شے کو دیکھنا اور چھونا، اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے، جتنا ایک ہی شے کو سننا اور چھونا، ایسے یہ کہنا کہ فاصلہ محسوس و بصردو دونوں ہے، ایک مہل بات ہے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ فوۃ لامسہ کے محسوسات، یعنی امتداد بعد فاصلہ وغیرہ کا باصرے براہ راست احساس نہیں ہوتا، بلکہ خاص مرئی علامات کے توسط سے لمسی احساسات کی جانب بے شعور ذہن کا انتقال ہو جاتا ہے، جسکی وجہ ان دونوں کا وہ مابینی علاقہ ہے جس کا حکم متواتر تجربہ ہوتا رہتا ہے، اور جو لازماً ان دونوں کے مابین ذہنی استلافات پیدا کر دیتا ہے۔ ساقھی یہ بھی معلوم ہے کہ ان علام بصرو محسوسات لمس میں کوئی لزومی ارتباط نہیں ہے، مثلاً موجودہ تجربہ کی رو سے جب کوئی چیز قریب تر ہوتی ہے تو بڑی نظر آتی ہے اور بعید تر ہوتی ہے تو چھوٹی۔ جس سے بڑائی نزدیکی کی علامت بن جاتی ہے اور چھوٹی دوری کی۔ لیکن فرض کرو کہ آنکھوں کی ساخت ایسی واقع ہوئی کہ اسکے بالکس تجربہ ہوتا، یعنی جب کوئی چیز قریب ہوتی تو چھوٹی دکھائی دیتی، اور دور ہوتی تو بڑی تو یہ علامات بھی تو اپنی دلالت کے لحاظ سے الٹ جاتیں، یعنی جب کوئی چیز چھوٹی نظر آتی تو ہم اسکو نزدیک سمجھتے اور جب بڑی نظر آتی تو دور اس سے معلوم ہوا کہ نفس بڑائی یا چھوٹائی کو قریب یا بعد کیساتھ کوئی لزومی علاقہ نہیں جسکی بنا استلاف ذہنی سے ماورا کسی اور چیز پر ہو۔ لہذا علام بصرو محسوسات لمس سے وہی تعلق ہے، جو لفظوں کو معانی سے جس طرح کسی لفظ سے معانی کی طرف

محض تواثر استعمال اور امتلاط ذہنی کی بنیاد نہیں دوڑ جاتا ہے، بعینہ اسی طرح ایک مٹی
علامت سے لمسی محسوس کی جانب۔ تو گویا یہ علام لہصری ایک طرح کی زبان کا کام دیتے
ہیں جسکو برکے لسان الہی قرار دیتا ہے جو ہمارے مقدمات اربعہ کا آخری نمبر ہے۔

ماحصل یہ ہے کہ جدید نظریہ رویت کے وجود میں آنے سے پہلے عام طور پر یہ خیال
کیا جاتا تھا کہ خارجیت فاصلہ یا بعد اور شکل و امتداد وغیرہ کا حاسہ بصر سے اسی طرح بالذات
دبراہ راست احساس ہوتا ہے جس طرح حاسہ لمس سے برکے نے یہ ثابت کیا کہ بعینہ کوئی ایک
ہی شے مشترک طور پر براہ راست دو حاسوں سے نہیں محسوس ہو سکتی البتہ ہر حاسہ میں اسکی
قابلیت ہے کہ وہ اپنے خاص محسوسات کے توسط سے گذشتہ تجربات و امتلاطات ذہنی
کی بنا پر دوسرے حاسوں کے احساسات کا کتابی طور پر علم حاصل کر سکتا ہے۔ لہذا
فاصلہ و امتداد وغیرہ جو بالذات صرف قوۃ لامسہ سے محسوس ہوتے ہیں انکے لئے اُن کا صرف
اس طرح علم حاصل ہو جاتا ہے کہ رنگ و روشنی کے خاص خاص مری احساسات کے ساتھ
جن مختلف لمسی احساسات کا تجربہ ہوتا ہے انکی جانب مری احساسات سے اسی طرح نہیں
منتقل ہو جاتا ہے جس طرح الفاظ سے معنی کی جانب۔ لیکن اگر کوئی شخص زبان سے ناواقف
ہو، تو وہ ان لفظوں سے کوئی مطلب نہیں نکال سکتا، چنانچہ اگر ایک ماہرہ دانہ بھکی آنکھوں
میں دفعۃً بینائی آجائے تو اسکو رنگ و روشنی تو نظر آوے گی۔ لیکن اس سے وہ اشیاء کے
لمسی امتداد و فاصلہ پر استدلال نہ کر سکے گا اور لازماً اسکو کوئی شے اپنے سے دور یا نزدیک
نہ معلوم ہوگی بلکہ ہر چیز انکے لئے اندر یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ ذہن میں محسوس ہوگی۔

اتفاق یہ کہ برکے کی زندگی میں ۱۲۰۰ میں جب سلطان نامی ایک شخص نے ایک رسالہ
میں کسی ایسے آدمی کے متعلق اپنے مشاہدات شامع کیے جو بچپن سے اندھا تھا۔ لیکن بعد از

کے آنکھ میں روشنی آگئی، اس بیان کا اقتباس برکھے نے نظریہٴ لسانِ لصری کا اثبات و تشریح کے نام سے جو رسالہ لکھا ہے، اُس کے آخری بند میں درج کیا ہے جسکے چند جملے یہ ہیں۔

”جب پہلی مرتبہ اُس نے دیکھا تو وہ مختلف فاصلوں کا تصفیہ کرنے سے اتنا ہی ناچار تھا کہ (جیسا کہ اُس نے ظاہر کیا) یہ خیال کرتا تھا کہ تمام چیزیں اسکی آنکھوں سے اسی طرح مس ہوتی ہیں جس طرح وہ چیزیں جنکو وہ چھوتا ہوا کھال سے مس کرتی ہیں..... نہ اسکو کسی چیز کی شکل کا پتہ چلتا ہے نہ وہ دو چیزوں میں خواہ وہ شکل و امتداد کے لحاظ سے کتنی ہی مختلف کیوں نہوں فرق داتا کر سکتا تھا، لیکن جب اسکو یہ بتلایا جاتا تھا کہ فلاں چیز وہی ہے جسکی شکل کو تم پہلے چھو کر جانتے تھے، تو وہ اس کو نہایت غور سے دیکھتا تھا، تاکہ وہ دوبارہ اس کو پہچان سکے مگر چونکہ ایک ساتھ اُس کو بہت سی چیزیں سکھنا پڑتی تھیں اسلئے وہ بھوتوں کو بھول جاتا تھا“

بعد میں اور بھی اسی صنف کے بہت سے تجربات کیے گئے ہیں۔

برکھے کے اس اکتشاف سے اُسکے اصل فلسفہ اور مبادی کے نظریہٴ الہیات کی تائید ہو یا نہ ہو، لیکن علم النفس میں رویت کے اس نظریہٴ جدید کی جو اہمیت و عظمت ہے، اس کا دوست و دشمن سب کو اعتراف ہے اور آج یہ اکتشاف عظیم کہنا چاہیے کہ نفسیات کے اُن اور ہمت البواب میں داخل ہے جسکو کوئی عالم نفسیات نظر انداز نہیں کر سکتا۔ گذشتہ صدیوں کے اندر اسکی تائید و تنقید پر جتنا لٹریچر پیدا ہو چکا ہے، اس کو اگر یکجا کر دیا جائے تو ایک دفتر کا دفتر بن جائے گا۔

۲۔ مبادی علم انسانی

یہی کتاب برکھے کا وہ کارنامہ ہے جسکی بنیاد پر یہ کہنا بالکل مبالغ نہیں کہ وہ فلسفہٴ جدید پر

کا کوپرنیکس، جس طرح کوپرنیکس کے انکشاف نے ہزار سال کے نظام ہیئت کو بالکل الٹ دیا، اور متحرک کو ساکن ساکن کو متحرک کر دکھایا، اسی طرح مبادی کے نظریہ الہیات نے فلسفہ کا نوج ادھر سے ادھر پھیر دیا۔ جس چیز (مادہ) کو سیکڑوں ہزاروں سال سے قدیم جدید فلاسفہ ناقابل انکار حقیقت یقین کرتے چلے آتے تھے وہ محض دھوکے کی ٹٹی اور ایک فرضی شے نکلی۔ مل نے لکھا ہے کہ برکلی کے مابعدیہ و اقبل کے فلسفین اتنا ہی غلطی پرانے فرق پیدا ہو گیا ہے، جتنا قدیم و جدید تاریخ یا طبیعیات میں۔

ہم کو اصل میں اسی کتاب نے اسپرکامادہ کیا کہ ہندوستان کی وسیع ترین زبان کو فلاسفہ کے زمرہ میں سب سے اول برکلی سے واقفیت کا شرف حاصل ہونا چاہیے کتاب کے اصلی مباحث سے پہلے ایک مبسوط مقدمہ ہے، جو کل کتاب کا تقریباً ایک ربع ہے، اس میں تمام نراس پر بحث ہو کر تصورات مجردہ یا کلیات کا ذہن میں مطلق وجود نہیں۔ اسپرکلی نے بہت زیادہ زور اس لیے دیا کہ اس کے نزدیک مادہ کا اعتقاد و عقیدہ تجرید ہی کے سیٹات میں داخل ہے۔ مل نے تو اس کو برکلی کے ان انکشافات ثلاثہ میں شمار کیا ہے زمین سے ہر ایک بجائے خود انسانی عظمت کے لیے کافی ہے بقیر دو جدید نظریہ رویت، اور مبادی کا نظریہ الہیات میں چونکہ اپریل ۱۸۵۷ء کے معارف میں ”تصورات کلیہ“ کے عنوان سے اسی بحث پر ایک تفصیلی مقالہ شائع ہو چکا ہے، اس لیے بخوف طوالت ہم یہاں اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔ باقی اصل کتاب کو خود مصنف نے تین مباحث پر تقسیم کیا ہے جن میں سے اول نظریہ کی تشریح و اثبات ہے۔ اسی لیے وہ سب سے زیادہ اہم ہے۔

۱۔ دعویٰ یہ ہے کہ ذہن اور ادراکات ذہنی کے ماورائیات میں کسی تیسری چیز کا وجود نہیں ثابت ہوتا۔ ہمارے نزدیک اس دعویٰ کے متعلق ایک سوچنے والے آدمی کی تشفی کے لیے شروع کے دو بندوں میں برسکے نے جو کچھ کہ دیا ہو، بس وہی بالکل کافی ہے۔ انسان جو کچھ جانتا ہے۔ اگر اسکی تحلیل کیجائے تو اصولاً کل تین چیزیں ممکن ہیں گی۔ (۱) وہ احساسات جنکا براہ راست آلاتِ حس سے علم ہوتا ہے (۲) لذتِ المِ محبت و نفرت، غصہ و خواہش وغیرہ کے جذبات اور ارادہ (۳) حافظہ اور تخیل کی مدد سے ان دونوں کا اعادہ ذہنی۔ انکی باہمی ترکیب و تحلیل اور دوسرے تصرفات ذہنی جنکو فکر و استدلال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ موخر الذکر دونوں اصناف کے تو ذہنی اور محض ذہنی ہونے میں کلام ہی نہیں بہر شخص جانتا ہے کہ خارج از ذہن ان کا کوئی وجود نہیں۔ گفتگو صرف اوّل الذکر میں ہے،

آلاتِ حس سے ہم کو رنگ، امتداد، ذائقہ، آواز، بو، سردی، گرمی، سختی، نرمی وغیرہ کے مختلف اور ان گنت احساسات حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے جب چند خاص خاص احساسات ہمیشہ ایک ساتھ محسوس ہوتے ہیں تو ان کے لیے زبان میں کوئی ایک مستقل نام پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب ایک خاص ذائقہ رنگ و بو اور شکل و صورت کا برابر کیا اور ایک وقت اور اک ہوتا ہے تو اس کو ہم سیب کہتے ہیں۔ عوام الناس اسی مجموعہ احساسات کو موجود فی الخالق شے خیال کرتے ہیں، لیکن فلاسفہ کا یہ عقیدہ ہے کہ نہیں یہ تمام احساسات محض صفاتِ اعراض ہیں جنکی تمیز میں ایک جوہر یا محل ہے جسکے ساتھ یہ قائم ہیں۔ حقیقی اور مستقل بالذات وجود صرف اس محل کا ہے۔ یہ خود ناقابلِ حس و ادراک ہے، اغراض کی وساطت

سے اُسکے وجود کا قیاسی علم حاصل ہوتا ہے۔ بس یہی ایک لفظ میں مادہ ہر جہ کا ہر کچلے قطعاً منکر ہے۔
 مادہ کی اس تشریح بالا میں ایک سے زائد بحث طلب بیانات اور غیر ثابت عادی
 شامل ہیں۔ احساسات کو اعراض کہنے کے کیا معنی ہیں؟ اعراض کے قیام کے لیے کسی
 موجود فی الخالچ جو ہر جسمی کا وجود کیوں ضروری ہو؟ خود ادراک کرنے والا نفس اُنکے
 قیام کے لیے کیوں نہیں کافی ہو؟ یہ سب اور غیر محسوس جو ہر ذی حس اذہان یا نفوس
 میں کوئی تصویر یا احساس کیونکر پیدا کرتا ہو؟ اور اُن پر کیونکر عمل کرتا ہے؟ ان میں سے
 ہر چیز کا بار ثبوت مدعیانِ مادہ کی گردن پر ہے، اور کسی ایک سے بھی عہدہ نہ ہونا آسان
 نہیں۔ لہذا ہر کچلے کے انکار کے لیے صرف اسی قدر کافی تھا، کہ ایک ایسی شے کا وجود
 کیوں قبول کیا جائے جبکہ نہ تو براہِ راست خود محسوس سے علم ہوتا ہے، نہ کسی قیاسی
 محنت سے اسکی طرف ناگزیر احتیاج ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اُس نے صرف اس پر
 قناعت نہیں کی، بلکہ یہ دکھلایا کہ یہ دعویٰ مستلزم تناقض ہے۔ کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے
 کہ ہمارے محسوسات یا تصورات حسیہ مثلاً شکل و امتداد و حرکت وغیرہ محض ذہنی
 نہیں ہیں، بلکہ اس شکل، امتداد و حرکت کے مائل اور نمائندہ ہیں جو ایک حناج
 اندہن جو ہر جسمی میں موجود ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ آیا خود وہ حرکت شکل یا امتداد
 جو خالچ میں جو ہر جسمی کے ساتھ قائم ہے، محسوس ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ بھی ہمارا
 ایک ذہنی تصور ہے اور اگر نہیں، یعنی یہ خارجی شکل و امتداد وغیرہ خود محسوس نہیں
 اور ہمارے احساسات و تصورات سے کلیتہً بیگانہ ہیں تو پھر وہ کسی ایسے چیز کے مائل
 کیسے ہو سکتے ہیں جو محسوس و تصور ہے، اس لیے کہ ایک دوسرے تصور کے علاوہ کسی
 اور شے کے مانند نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو تھائے باؤن میں ایک کانٹا جھجھکتا ہو جس سے

ایک قسم کا درد محسوس ہوتا ہے، اب درد کا یہ احساس یا تصور اگر مشابہ ہو سکتا تو کسی دوسرے تصور درد ہی کے مشابہ ہو سکتا ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ایسے درد کے مانند ہو جس کا محسوس احساس نہیں ہو سکتا۔ برکے نے اسی استدلال پر بے انتہا زور دیا ہو اور سچ یہ ہو کہ جس قدر وجود مادہ کے اس عقدہ کو کھولنا چاہو، اُسی قدر یہ اور لاخصل ہو جاتا ہو۔

بہ خلالت اس کے، خود برکے کا نظریہ اس طرح کے اشکالات سے بالکل پاک اور برہی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے تصورات حسیہ سے مادرا اور خالچ کسی غیر محسوس شے کے وجود کا مدعی ہی نہیں ہے، لہذا خود اپنے تصورات ذہنی کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہو اور تصور دادراک کرنے والی ذات کے وجود سے زیادہ جس کو ہم انا، ایغو، نفس، ذہن وغیرہ کہتے ہیں اور کون سی چیز یہی یا قطعی ہو سکتی ہے۔ البتہ چونکہ ان تصورات حسی کا پیدا اور فنا ہونا انسانی ارادہ کے ماتحت نہیں ہو۔ یعنی یہ کہ مثلاً ہم آنکھ کھولیں۔ اور یہ چاہیں کہ کوئی چیز نہ دکھائی دے، یا فلاں چیز پہلے اور فلاں بعد کو نظر آئے تو یہ آدمی کے بس سے باہر ہے، اس لیے لامحالہ ایک ذمی ارادہ اور فاعل نفس یا روح کا قائل ہونا پڑتا ہے، جو ان تصورات حسی کو انسان کے ذہن یا نفس پر مرم کرنا رہتا ہو، اسی کو برکے روح برتر یا خدا کہتا ہے، اس میں شک نہیں کہ ایک بے حس بے ذہن ارادہ معلوم جو ہر آدمی کے قبول کرنے سے (جو فلاسفہ کے نزدیک ذہن میں تصورات حسی کو متبیح کرتا ہے) یہ زیادہ آسان ہے کہ ہم ایک اپنے ہی جیسے لیکن زیادہ وسیع لہذا زیادہ حکیم غرض چرچیت سے ایک کامل روح یا نفس کا وجود تسلیم کر لیں جو انسانی ذہان پر تصرف ہے، اور اپنے ہی مقتدر کردہ اصول کے ماتحت، جن کو حکمت کی زبان میں قوانین فطرت کہا جاتا ہے ان ذہنوں میں تصورات خلق کرنا رہتا ہے، بس تو

کہنا چاہیے کہ برکے کے نظام فلسفہ کے تین عناصر ترکیبی ہیں: ذہن انسانی، اخلا، اور وہ تصورات حسی، جنکو خدا انسان کے ذہن پر نقش کرنا دیتا ہے، جس سے باہر ان کا کوئی وجود نہیں؛ یا ایک لفظ میں یوں کہو کہ مادہ اور روح کی دونی کوٹا کر خالص فلسفہ روحی برکے کا فلسفہ ہے۔

۲۔ دوسرے حصے میں (بند ۳ تا ۸) ان مختلف اعتراضات کا جواب ہے جو اس نظریہ پر کیے جاسکتے ہیں؛ یوں تو تعداد میں یہ ایک درجن سے زائد ہیں لیکن ان میں سے بعض مکرر اور بعض بالکل سطحی ہیں۔ اس لیے یہاں صرف چار پانچ کا جو نسبتاً اہم ہیں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ جب آدمی کو تمام چیزیں اپنے سے الگ مختلف فاصلوں پر آنکھ سے علانیہ نظر آتی ہیں تو پھر وہ اُن کو محض ذہنی کیسے قرار دے سکتا ہے؟ یہ اعتراض اس لحاظ سے بہت زیادہ اہم اور قابل اعتنا تھا کہ اشیائے وجود خارجی کا اذعان سمجھنا چاہیے کہ سنا یا اسی پر مبنی ہے، اس لیے سب سے اول برکے نے جدید نظریہ رویت لکھ کر اس کا قلع قمع کیا اور موافق و مخالفت سب سے منوالیا کہ فاصلہ براہ راست مرنی نہیں اور اسکو محسوس بصر سمجھنا ایک دھوکا ہے۔

(۲) اس اصول کی بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ تمام چیزیں محض ذہنی اور خیالی ہیں حقیقی آگ جو جلاتی ہے اس میں اور اُس کے ذہنی تخیل میں کوئی فرق ہی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ نہیں ان دونوں میں وہی فرق ہے جو واقعی درد اور اُس کے محض تخیل میں لیکن پھر بھی یہ کوئی نہیں کہتا کہ واقعی درد درد محسوس کرنے والے سے باہر موجود ہے یا نفس احساس کے علاوہ اس کا کوئی اور وجود ہے۔

(۳) ایک قباحت یہ پیدا ہوتی ہے کہ اگر تصورات حسی کی صرف اتنی ہی بساط ہو کہ جب تک ذہن ادراک کرتا ہے موجود ہیں، ورنہ لاشعے محض ہیں۔ تو اسکے معنی یہ ہونگے تمام چیزیں ہر وقت فنا، اور از سر نو پیدا ہوتی رہتی ہیں برکھے کی جانب سے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک ذہن سے کوئی چیز غائب یا فنا ہو جاتی، تو وہ اور ذہنوں میں موجود رہتی ہے اور اگر تمام اذہان فنا ہو جائیں تو بھی خدا یا روح برتر ان کو ہر آن کا وجود قائم ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ تمام چیزیں از سر نو پیدا اور فنا ہوتی رہتی ہیں تو اس میں استحالہ یا اعتراض کی کیا بات ہے۔ بجز اسکے کہ ہمارے عایانہ خیال و یقین کے خلاف ہے۔ تو ایسی سیکڑوں خلاف واقع باتیں ہیں جو نسلا نسل سے دلوں میں بٹھ گئی ہیں اور ان کا نکلنا آسان نہیں۔

(۴) فلسفہ طبیعی اور ریاضیات میں نیوٹن وغیرہ کے ایجاد کردہ سیکڑوں ہزاروں اکتشافات و مسائل ایسے ہیں جنکی صحت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اور ان سب کا تعلق بہ ظاہر مادہ اور موجودات خارجی سے ہے۔ جواب صاف یہ ہے کہ اگر مادہ سے مراد وہ نامعلوم شے ہے جس کا ذہن کو مطلق شعور و ادراک نہیں ہوتا، تو ظاہر ہے کہ ریاضی اور حکمت کے مباحث کو اس سے ذرہ بھر سروکار نہیں۔ باقی اگر وہ محسوسات مراد ہیں جن کا آلاتِ حس سے ذہن کو علم حاصل ہوتا ہے اور جو تمام فیضی حکمیات (سائنسز) کا موضوع ہیں تو ان کے حقیقی ہونے کے ہم عام فلاسفہ سے زیادہ معترف ہیں کہ ہمارے اصول کی رد سے احساس ہی تو خیر و ان کی اصل حقیقت ہے۔

۳۔ اس آخری اور تیسرے حصہ میں انسانی نفس اور روح برتر خدا کی ماہیت اور افعال و خواص کے علاوہ ان متعدد و مفید نتائج کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، جو

جو اس اصول جدید کے ماننے سے حاصل ہوتے ہیں، فلسفہ یا الہیات کی بہت سی گتھیاں، جنکی پیچیدگی ہزار ہا سال کی فکر و بحث کے بعد بھی اور بڑھتی جاتی ہے اور خود حل جاتی ہیں مثلاً مادہ جو جسمی میں فوتِ فکر ہے یا نہیں۔ مادہ لائی نہایت منقسم ہے یا نہیں اور یہ مادہ نفس پر کیونکر عمل یا تصرف کرتا ہے اس قسم کی تمام مشکلات جو ایک ذہن اور غیر محسوس جو ہر کے خارج از نفس ماننے سے پیدا ہوتی ہیں، دفتہ فلسفہ کے حدود سے شہر بدر ہو جاتی ہیں۔ ارتیا بیت کا جو زہب کی سب سے خطرناک دشمن ہے، ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا دار و مدار سراسر شہادتِ حواس کی نگہب اور مادہ کے وجود خارجی پر ہے بلکہ شکل، حرکت، استداد وغیرہ کی نسبت اگر یہ خیال کر لیا جائے کہ وہ محض ذہن کے احساسات ہیں تو وہ پوری طرح معلوم ہیں اور ان میں کوئی شے نہیں رہ جاتی جو نامحسوس ہو۔ لیکن اگر ان کو خارج از ذہن موجودات کا اس باطنی قرار دیا جائے تو قدر تاہم ارتیا بیت میں بھٹس جاتے ہیں..... (کیونکہ اس صورت میں اشیاء خارجی تو علیٰ حالہ باقی رہتی ہیں۔ لیکن ہمارے احساسات یا تصورات میں اختلاف پیدا ہونا رہتا ہے اب یہ فیصلہ کرنا ہمارے بس سے باہر ہے کہ ان مختلف تصورات میں سے کون سا تصور یا سرے سے کوئی بھی اس حقیقی صفت کی نمایندگی کرنا ہے جو فی نفسہ خارج از ذہن شے میں موجود ہے، لہذا جو کچھ ہم دیکھتے سنتے اور محسوس کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ محض وہم و تخیل ہو۔

خود اصل کتاب یعنی مبادی میں متعدد تعلقات تھے بعض مقامات ناصاف اور گنگناک تھے، ترتیب بھی ذرا ناقص ہے، مکرار اور اعادہ بھی بہت ہے

کمین کمین حد سے زیادہ اجمال ہو گیا ہے چنانچہ ان نقائص کا خود برکے کو بھی
 احساس ہوا اور بیس سال بعد جزیرہ رہوڈس سے سیول جانس کے نام خط میں لکھا ہے کہ جو کچھ
 آپ نے دیکھا وہ اس وقت چھپا تھا جب میں بالکل نوجوڑ تھا اور بلاشبہ اس میں بہت
 سے نقائص ہیں کیونکہ اگرچہ خیالات اپنی جگہ پر صحیح ہوں (جیسا کہ مجھ کو یقین ہے) تاہم
 چونکہ زبان عام استعمال اور سلمات کے لیے ڈھل گئی ہے اس لیے ان کا وضاحت
 کے ساتھ بیان کرنا نہایت مشکل ہے، لہذا میں اذعان میں کرنا کہ میری کتاب میں (نظریہ ریت
 بھی داخل ہے) کیونکہ اسکے عیر الغم اور ولیدہ ہونے کی لوگوں کو مبادی سے زیادہ
 شکایت تھی، صداقت کی معلوم ہو سکتی ہیں، میں جو کچھ اُسید رکھتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ خود
 اپنے ذہن و خیالات پر غور کرنے سے متجرب آدمیوں کے لیے یہ کتاب میں صداقت
 یابی کا آلہ بن سکتی ہیں، ان اسباب کو جو مجھ سے لازماً برکے کے خیالات کی نسبت بہتوں کو
 غلط فہمیاں ہوئیں، مخالفین کے اکثر اعتراضات انہی غلط فہمیوں پر مبنی ہیں جن لوگوں
 کو فلسفہ سے زیادہ مذاق نہ تھا ان کو اور بھی وقت پیش آئی چنانچہ برکے کا خود ایک دست
 جان پرسیول اُسکو لکھتا ہے ”اگر میں اس کتاب کو پڑھوں بھی تو بھی پوری طرح سمجھ
 نہ سکوں گا، کیونکہ میں نے فلسفہ کا زیادہ مطالعہ نہیں کیا ہے“ لہذا ہنر کتاب کے مہات
 مباحث کو اختصار کے ساتھ ذرا صاف کر کے اور لکھ دیا ہے۔ لیکن جو لوگ معقولات
 سے ذرا گہرا مذاق رکھتے ہیں ان کو چاہیے کہ خود مبادی کو غور سے اور خالی الذہن
 ہو کر، بلکہ ہو سکے تو ایک سے زائد بار پڑھیں۔ کیونکہ بے اسکے نہ تو وہ کتاب کے عیب
 و ہنر سے واقف ہو سکتے ہیں۔ نہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ نہ اس کا بظاہر

متبعہ نظریہ کے متعلق یقین و اذعان کی کیفیت ذہن میں پیدا ہوتی ہے بلکہ اس آخری مقصود کے لیے تو محض کتاب کا پڑھ جانا بھی کافی نہ ہوگا جب تک کہ وہی خود بے انتہا نہ سوچے۔ اسی لیے برکھ نے خود کوئی جگہ استدعا کی ہے کہ میرے لفظوں کو فقط اپنی فکر کا آلہ بناؤ اور پڑھتے وقت اپنے ذہن میں اُسی سلسلہ خیالات کو پیدا کرو جو میں لکھتے وقت رکھتا ہوں۔

اولین اشاعت میں مبادی کے ساتھ نہایت بے اعتنائی اور تحقیر کا بڑا لگایا گیا جسکی بڑی وجہ یہی تھی کہ خود اصل کتاب لوگوں نے تامل سے پڑھنے کی رحمت نہ گوارا کی، اور منکر بھڑک گئے کہ برکھ تو اس موٹی سی بات کا منکر ہے کہ ذہن سے باہر کسی شے کا وجود نہیں اس موقع پر جان ہر سیول کے اُس خط کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جو اُس نے مبادی کی پہلی اشاعت کے بعد برکھ کو لندن سے لکھا ہے: میں نے اپنے بعض نہایت ہی لائق احباب کے سامنے تمہاری کتاب مبادی کے موضوع بحث کا نام ہی لیا تھا کہ اُنھوں نے ہنسی اڑانی شروع کر دی، ساتھی بائیسکے پڑھنے تک سے انکار کر دیا جسکے لیے اب تک کسی کو بھی نہیں آمادہ کر سکا ہوں..... ایک میرے شاگرد طبیب نے البتہ تمہاری ذات خاص کی نسبت اظہار رائے کی رحمت گوارا کی، اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ برکھ قطعی پاگل ہے، اسکو اپنا علاج کرنا چاہیے۔ ایک ہشپ نے اس بنا پر تاسف کیا کہ کسی نئی بات کے پیدا کرنے کی آرزو دانشمندی نے تم کو ایسی حرکت پر آمادہ کیا۔ لیکن جب میں نے اس الزام کے خلاف تمھارے کیرکٹر کی دکالت کی اور تمھارے دوسرے قابل متائش اوصاف کا ذکر کیا، تو کہا کہ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیا خیال ان کی نسبت قائم کروں۔ ایک اور شخص نے یہ کہا، کہ کوئی طباع آدمی

جب اپنی ذہانت کا استعمال کرے تو اس کی دلگنی نہ کرنی چاہیے، لیکن یہ باتیں کچھ نئی اور چند ان قابلِ تعجب نہیں ہیں، عقیدہ عام کے خلاف جب کوئی عظیم تحقیق و انکشاف پیش کیا گیا ہو تو شروع شروع میں یہی سلوک ہوا ہو۔

مصنف کی زندگی میں مبادی دو بار بھی جب پہلا ایڈیشن نکلا، تو اس پر حصہ اول لکھا تھا، دوسرا حصہ لکھ لکھا کر اٹلی کے اٹھارے سفر میں کہیں ضائع ہو گیا۔ لیکن اس حصہ دوم کے کیا مباحث تھے، اس کا کسی قدر اندازہ خود برکے کے ایک خط سے ہو سکتا ہے جو اس نے حصہ اول کی طبع کے وقت لکھا ہے۔ اس کتاب کا مقصد خدا کا وجود اور اس کے صفات کی توضیح و اثبات، روح کی ابدیت، خدا کے علم غیب اور انسان کے اختیار کا تحقق ہے۔ اور تعلیمات نظریہ کے متعدد حصوں کی ہمیت اور کذب کی پردہ دری کر کے لوگوں کو مذہب اور سود مند چیزوں کے مطالعہ کی طرف مائل کرنا ہے۔ ان میں سے بعض باتیں تو حصہ اول میں اشارتاً اور اجمالاً آگئی ہیں۔ اور بعض بالکل نہیں ہیں اور دوسرے حصہ میں غالباً انہی پر مفصلاً بحث ہوئی۔ اگر ہمارا قیاس صحیح ہو تو اس کا زمانہ کے تلف ہو جانے کا فلسفہ سے زیادہ علم کلام کو احساس ہونا چاہیے

۳۔ مکالمات ماہینِ ہلوس و فلوئس

برکے کو مادہ کے عدم وجود کا اتنا ہی اذعان تھا، جتنا دنیا کو اس کے وجود کا ہے۔ ساتھ ہی اس کو یہ بھی یقین تھا کہ اس کے خیالات کو توجہ سے سننے کے بعد قطعی بہت سے انصاف پسند آدمی ہم آہنگ ہو جائیں گے، اس لیے نظریہ جدید اور مبادی کے ساتھ

اپنے برکے (ایک دوسرے فلاسفلے کیس) صفحہ ۱۱۲ء و ۱۱۳ء علی الترتیب

جو فادری اور بے اتفاقی کا سلوک ہوا تھا، اس سے شکستہ خاطر ہو کر وہ پچلا نہیں بیٹھ سکتا
 تھا، ابکی اُسے فلاسفہ کے محدود دائرہ سے نکل کر وسیع تر پبلک میں اپنی آواز کو سوجھنا
 کی کوشش کی۔ مبادی کا اسلوب علاوہ بعض جزئی تفصیلات کے خالص فلسفیانہ تھا، مکالمات
 اپنے موضوع اور مباحث کے لحاظ سے اگرچہ مبادی ہی کا نقش ثانی ہیں لیکن روشنی
 کے عیوب اس سے قدرتا دور ہو چکے تھے، اسکے اسوا بالقصد مصنف نے اسکو بہت
 زیادہ سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کی، زبان کا لطف بھی بڑھ گیا۔ کہیں کہیں
 انشا پردازی کا چٹکارہ ہے، اور ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ مکالمہ کا اسلوب ہی قدتی
 طور پر ایسا ہوتا ہے کہ حریف کے اعتراضوں کا جواب زیادہ خوبی سے دیا جاسکتا ہے۔ شکل
 شکل سکھ باتوں باتوں میں ذہن نشین ہو جاتا ہے اور پڑھنے والے کو بوجھ نہیں معلوم ہوتا۔
 ان تمام چیزوں کا لکریہ اثر ہوا کہ جو شخص پرسیدل مبادی کو اپنی فہم سے بالاتر
 خیال کر کے پڑھنے کی ہمت نہیں کرتا تھا، اُسے لکھا کہ سچ یہ ہر کہ پہلے کی نسبت اب میں ابکا بہت
 زیادہ بھیجیال ہو گیا ہوں، اقل اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ ابکا خیال بھی اسبقہ اعلیٰ ہے جتنا وہ
 خیال جبکی آپ ترمیم کرتے ہیں اور کم انکم دونوں برابر درجہ کی دشواریوں سے دوچار ہیں، مکالمات
 کے قول عام کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ برکھے کی زندگی ہی میں اسکے تین ایڈیشن نکلے
 فرانسیسی میں نہایت اہتمام سے ترجمہ ہوا اور اسکے انتقال کے تین ہی برس بعد جرمن میں ترجمہ ہو گیا
 تعداد میں یہ مکالمات کل تین ہیں موضوع بحث کے اتحاد کے ساتھ کہنا چاہیے کہ
 ترتیب مضامین بھی ۱۰۰ صفحہ بالکل مبادی ہی کی ہے۔ البتہ مبادی پر جو بعض نے
 اعتراض کیے گئے تھے ان کا جواب زیادہ تفصیل کے ساتھ دیا گیا ہے لیکن حقیقت
 اسے بیک ڈور پر رکھتے صفحہ ۱۰۰۔

یہ ہے کہ دو سو سال کی مدت میں بریکلے کے فلسفہ پر مخالفین اور ناقدین نے جو نقض یا اعتراضات پیش کیے ہیں، وہ سب مع اپنے نوڑ کے صراحتاً یا ضمناً خود مبادی ہی میں موجود ہیں۔ ان میں سے جو زیادہ اہم تھے ان کو ہم تلخیصاً مبادی کے اور مباحث کے ساتھ اوپر بیان کر چکے ہیں اس کے علاوہ ہمارے مشہور اور عزیز ترین دوست مسٹر عبد الماجد خود ان مکالمات کا ترجمہ کر رہے ہیں اور امید ہے کہ فلسفہ بریکلے سے کچھ ہی آگے نیچھے شائع ہو، ہم اپنے انسانی فطرت شناس دوست کے انتخاب کی اس حیثیت سے داد دیتے ہیں کہ اردو میں مبادی سے پہلے مکالمات کا شائع ہونا زیادہ موزون تھا جو لوگ مبادی کے خالص فلسفیانہ خشک و بی مزہ اسلوب تحریر کے پڑھنے کی تاب نہ لا سکیں ان سے ہماری التجا ہے کہ بریکلے سے صحیح واقفیت حاصل کرنے کے لیے کم از کم ایک بار نوجہ سے مکالمات کو تو شروع سے آخر تک پڑھنے کی زحمت گوارا کریں لیکن پیش نظر رہے کہ ناول یا ڈرامہ بھی نہیں ہے۔ ہے فلسفہ ہی۔

۴۔ ڈی مائو

یہ علت و معلول کی بحث براہِ اقلین زبان میں ۱۸۷۰ء صفحہ کا رسالہ ہریم لاطینی سے تالیفی کی وجہ سے اس کی نسبت کوئی رائے نہیں قائم کر سکتے، لیکن یہ مسئلہ فلسفہ کے اہمات مباحث میں داخل ہے، اس لیے بریکلے کے فلسفیانہ مصنفات کے ذیل میں اس کا کم از کم نام لے لینا ضرور تھا۔ فریڈر نے فٹ نوٹ میں چند سطریں اس کے خلاصہ کے طور پر لکھی ہیں۔ ہم انہی کے بعد دوسرے پر چند لفظ عرض کرتے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تمام چیزوں میں باہمی علت و معلول یا تاثر و تاثر

کا ایک فطری علاقہ ہے مثلاً جب ہم برف ہاتھ میں لیتے ہو تو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے جس سے تم یہ سمجھتے ہو کہ برف کی ذات یا ماہیت ہی میں کوئی ایسی بات (قوت) ہے جو یہ اثر پیدا کرتی ہے اور برف جب تک برف ہو اس سے یہ اثر منفک نہیں ہو سکتا، لیکن برکے کے نزدیک جس طرح یہ اثر یعنی ٹھنڈک صرف تھا را ذہنی احساس ہو، اور اس لیے محض ایک انفعالی شے ہو، اس لیے برف کا وہ کڑا جسکو تم فاعل اور مؤثر جانتے ہو اسکی حقیقت بھی تمہارے تصور ذہنی سے زیادہ نہیں (مبادی اور مکالمات بالمشین یہی ثابت کیا گیا ہے) اس لیے لازماً وہ بھی ایک منفعل چیز ہو، اور علت یا مؤثر جبکی حقیقت میں فاعل ہونا شامل ہو، نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ برف اور ٹھنڈک میں کوئی لزومی تعلق نہیں بلکہ تجربہ کی بنا پر ایک کا تصور دوسرے کا تصور پیدا ہونے کی نشانی بن گیا ہے۔ چنانچہ اگر تجربہ سے یہ ثابت ہوتا کہ برف سے گرمی کا احساس ہوتا ہے تو ہم اسکو گرمی ہی کی علامت یا بہ اصطلاح معرفت یہ کہو کہ علت سمجھنے لگتے۔ یہی وہ خیال ہے جو ہیوم کے مشہور نظریہ تعلیل کا سنگ اساس ہو، برکے اس میں مضامین نہیں سمجھتا کہ زندگی کے کاروبار میں عملی سہولتوں کے لیے ان علامت کو ظاہری یا میکانکی علل قرار دے لیا جائے۔ لیکن حقیقی اور فاعلی علت اس کے نزدیک صرف ارادہ راجح ہے۔

ڈی ماکو کا یہ نظریہ تعلیل، فلسفہ مبادی کی محض ایک تفریح (کار دلری) ہو، یہ رسالہ برکے کی خالص فلسفیانہ تصنیفات کا آخری کارنامہ ہے۔ اس کے بعد جن دو کتابوں کا ذکر آتا ہے، وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے براہ راست فلسفہ سے متعلق نہیں۔

۵۔ مکالمات السیغارن

یہ برکے کی تصانیف میں سب سے ضخیم تر ہے (۳۲۰ صفحے) نظریہ رویت، مبادی اور مکالمات
 ہائس تنون مل کر بھی اسکے برابر نہیں ہوتیں۔ ادبی حیثیت سے برکے کے مکالمات فلاطون
 اور سسرو کے مکالمات کے ہم پایہ گئے جاتے ہیں لیکن معنوی حیثیت سے مل
 اور سٹیفن وغیرہ کے خیال میں السیغارن اگر اتنے بڑے شخص کی لکھی ہوئی نہ ہوتی
 تو کسی خاص اعتقاد کی مستحق نہ تھی۔ برکے جیسے بلند رتبہ مصنف کا یہ سب سے کم قابلِ تہدیر
 کارنامہ ہے۔ زیادہ تر معمولی اور پیش پا افتادہ باتوں پر مشتمل ہے ہمارے نزدیک یہ
 رائے کسی قدر مبالغہ آئیز ہے، البتہ اتنا سچ ہے کہ حیثیت مجموعی نظریہ جدید اور مبادی
 کے مصنف کی شان سے بہت تر ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ السیغارن تمام تر کلامی
 مباحث کا مجموعہ ہے، اس لیے قدر تا وہ ایک خالص فلسفیانہ نگاہ میں نہیں محبتی۔ اور اس لیے
 اس پر تفصیل سے بحث کرنا ہمارے موضوع کی وسعت سے بھی خارج ہے۔ اس کی
 کلامی نوعیت بحث کی جانب ذرا سا اجمالی اشارہ کر کے ہم علم الاخلاق کے اس نظریہ
 پر البتہ توجہ دلانا چاہتے ہیں جو اس میں اگرچہ ضمناً آگیا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ اس فلسفہ
 اخلاق کا اساس ہے جس کا امام اعظم خود مل خیال کیا جاتا ہے۔

اس مجموعہ میں سات مکالمے ہیں السیغارن، جو ان ساتوں کا مشترک گیر کمر

۱۔ ردہ کا شہسور سیاسی اور خطیب و مقرر متقدم مین مرا۔ فلاطون کی طرح اُس نے بھی اپنے اکثر فلسفیانہ
 اور سیاسی خیالات مکالمات کے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ فلاطون سے استفادہ کا معترف ہے۔

۲۔ دیکھو ڈسٹرینس صفحہ ۱۱۷۹ اور *English Thought to in the Century* جز ۲، صفحہ ۴۳

ہے، اسی آزاد خیال گروہ کا نمائندہ اور دلیل ہر جس کے مقابلہ میں گاہیں کے مضامین لکھے گئے تھے، اور جو اطاعت غیر متقارمانہ، انالسٹ مقابلہ نام حکام وغیرہ کی تحریر کا محرک تھا، برکے کے کلامی اور اخلاقی نظریات کے لیے مکالمات السبقان کے ساتھ ان رسائل کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہو

اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کے افعال و اعمال پر اس کے خیالات اور عقائد کا بجا اثر پڑتا ہے، اس لیے ایسے عقائد جو نیکو کاری کی جانبائل کرنے اور بد کاری سے بچانے میں عین ہوں، ان کو قائم رکھنا چاہیے۔ مذہب کی تعلیمات یعنی وجود خدا، معاد جزا و سزا وغیرہ کا اذعان اور فرائض اخلاقی کا احساس اسی قسم کے عقائد میں شامل ہیں۔ یہ مذہبی اور اخلاقی خیالات اگرچہ مختلف اقوام و ممالک میں بے انتہا تفاوت نظر آتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ اسی طرح فطری ہیں جس طرح ایک ہی بیج، زمین آب و ہوا، اور طریق پرورش کے اختلاف سے مختلف رنگ، ذائقہ، اور بو باس کے پھل پھول پیدا کرتا ہے۔ شروع کے تین مکالمات میں انہی چیزوں پر تفصیلاً گفتگو ہے، مگر ان تمام باتوں کو قبول کرنے پر بھی اس شخص کی تسلی نہیں ہو سکتی جو سچائی کا متلاشی ہے۔ کسی اعتقاد کا مفید ہونا اور بات ہے اور اس کا واقعی وجود اور چیز ہے۔ یہ مان لیا کہ وجود خدا کے عقیدہ کو دلون میں باقی رکھنا سود مند ہو، لیکن اس سے یہ کیسے نکلا کہ خدا واقعا بھی موجود ہے، اس لیے جو تھے مکالمہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدا کی موجودیت کا اسی دلیل سے علم حاصل ہے جس سے ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ ہر آدمی کو براہ راست صرف اپنے افعال نفس کا علم ہوتا ہے، وہ اپنے ارادہ سے اپنے جسم میں مختلف حرکات پیدا کرتا ہے، ہوتا ہے

چلتا ہے، اٹھتا ہے، بیٹھتا ہے، اس لیے جب وہ کسی دوسرے جسم میں اسی قسم کی حرکات کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کا ذہن اپنے ہی جیسی ایک دوسری ذی ارادہ ذات کی جانب منتقل ہو جاتا ہے، اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسی کے ایسے اور اذہان و نفوس بھی موجود ہیں جن کو وہ بالذات محسوس نہیں کرتا بلکہ گفتگو یا حرکات جسم کے علاوہ سے اُن کے وجود پر استدلال کرتا ہے۔ اسی طرح اگر حوادث کائنات کی تحلیل کی جائے، تو وہ بھی مختلف طرح کے حرکات تکلیف گے جن میں اسی درجہ کا بلکہ اس سے بڑھ کر نظم و نسق ہے جتنا انسان کے حرکات ارادی میں ہوتا ہے۔ لہذا اس عالم کے شین کے لیے ایک محرک ارادی کا وجود قطعی ہے، اسکے علاوہ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ ہمارے محسوسات میں باہم علت و معلول کا کوئی لزومی علاقہ نہیں بلکہ ایک احساس سے دوسرے کی جانب اس طرح ذہن کا انتقال ہوتا ہے جس طرح کسی لفظ سے اُس کے معنی کی طرف۔ لہذا جس شے کو حکماء قوانین فطرت سے تعبیر کرتے ہیں، وہ دراصل لسانِ آسمی ہے جو ہم سے ہرگز اسی طرح ہم کلام ہے جس طرح ایک آدمی دوسرے آدمی سے باقی اخیر کے تین مکالموں میں عیسائیت کے مخصوص عقائد و تعلیمات کی حمایت کی ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہونے کے علاوہ اُردو پسک کے لیے نہایت غیر دلچسپ حصہ ہے۔ لہذا اُس کو چھوڑ کر کسی قدر بسط کے ساتھ ہم اس نظریہ اخلاق کو ذیل میں درج کرتے ہیں جو ابتدائی تین مکالموں میں اگرچہ مذہبی مباحث کے ضمن میں مذکور ہے۔ لیکن بجائے خود فلسفہ کے مباحث ابواب میں داخل ہے، اور اس لیے ہمارے دائرہ بحث کے اندر ہے۔

۱۔ دیکھو کہ ڈاکٹر آٹو صفحہ ۲۷۲ بتنے بے حد اجمال سے کام لیا ہے۔ انگریزی قانون کو چاہیے کہ چوتھے مکالمہ کو خود پڑھیں کہ خدا کیونکر انسان سے باتیں کرتا ہے نہایت دلچسپ ہے۔

اخلاقیات کے بیسیوں مذاہب میں جو مذہب سب سے زیادہ محقق اور یورپ
خصوصاً انگلستان میں مقبول ہے، وہ افادیت ہے، جس کے ائمہ بہتم، مل اسپنر وغیرہ
ہیں۔ افادمی فلسفہ اخلاق کی بنیاد دو اصولوں پر ہے (۱) انسان کی خواہشات اور
اسکے افعال کے محرکات کو اگر تحلیل کر کے دیکھا جائے تو وہ سب بلا استثناء کسی نہ کسی طرح
کے لطف و لذت کی طلب اور رنج و الم سے اجتناب پر مبنی ہوتے ہیں ساتھ ہی ایک
بڑی مسرت یا لذت کے حصول کی خاطر آدمی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو خوشی سے انگیز
کرتا ہے، اور معمولی یا ادنیٰ درجہ کی مسرتوں کو اس پر قربان کرتا رہتا ہے (۲) لیکن چونکہ
ہر فرد انسان کی لذت و راحت دوسرے افراد یا جماعت کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہے
جس طرح کسی جسم کے مختلف اعضا کی اپنے کل کے ساتھ اسیلے لازماً ہر آدمی کو اپنے انفرادی
افعال میں اجتماع کا ماتحت رہنا پڑتا ہے، اور جماعت کی فلاح و بہبود بالواسطہ افراد کی
فلاح و بہبود ثابت ہوتی ہے۔ لہذا وہ افعال جو انسانوں کی بڑی سے بڑی تعداد کے لیے
بڑی سے بڑی مسرت کا موجب ہوں۔ نظریۂ افادیت کی رو سے مستحسن ہیں۔ اور اسکے
خلاف قبیح یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ یہی اصول خیر و شر کے امتیاز کا معیار ہے۔ یہی
معیار کا پتہ لگانا فلسفہ اخلاق کا محرکہ آرا مسئلہ ہے۔ ہر کلمے نے ان دونوں اصولوں کو
جس خوبی اور وضاحت سے بیان کیا ہے، بعینہ اس کو درج کرتے ہیں۔

”جو اصول سب سے زیادہ عالمگیر اور انتہائی گہرائی کے ساتھ ہمارے دلوں پر
 نقش ہے وہ اپنی ذات کی محبت کا اصول ہے (۳) اسیلے قدرتی طور پر ہم تمام خیر و نیکو
 اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے ذاتی مسرتوں کی افزائش کے لیے مورد ہوں ہیں یا نہیں۔“

۱۔ دیکھو اطاعت عمر تقادمانہ بندہ۔

اور اسی نقطہ نظر سے ہم ان کو خیر یا شر کا لقب دیتے ہیں..... ہماری زندگی کی تمام تر شغولیت اول الذکر کے حصول اور ثانی الذکر سے اجتناب پر مبنی ہے۔ پہلے پہل جب ہم دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو ہماری رہنمائی کلیثۂ حواس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت فوری حسی لذت دالم ہی بُرے بھلے کا معیار ہوتا ہے، لیکن جیسے جیسے چیزوں کی ماہیت کے متعلق ہماری واقفیت بڑھتی جاتی ہے، ویسے ویسے ہم کو تجربہ سکھاتا جاتا ہے کہ اکثر فوری لذت آگے چل کر ایک بڑے الم کا باعث ہوتی ہے۔ ساتھ ہی فوری تکلیف بار بار آئندہ مسرت کا موجب ہوتی ہے..... لہذا ہمارے فیصلوں میں ایک تغیر واقع ہوتا ہے اب ہم آلات حس کی اولین طلب پر اطاعت کے لیے نہیں مستعد ہو جاتے، بلکہ اس پر غور کرتے ہیں کہ حسب معمول اس عمل سے آئندہ کس لذت کی توقع یا کس الم کا خوف ہو سکتا ہے۔ یہ خیال بار بار ہم کو ان فوری لطف اندوزیوں سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیتا ہے جن کے مقابلہ میں آئندہ زیادہ بڑی اور بااثر مسرتوں کی امید بندھ جاتی ہے.....“

(۲) کسی آدمی کو یہ نہ چاہیے کہ وہ اپنے کو ایک ایسا مستقل فرد سمجھ بیٹھے جسکی مسرت دوسروں کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کو چاہیے کہ اپنے کو ایک کل کا جز جانے اور اس کل کی مشترک صلاح کا تحت و متبع رہے، اور اپنے عادات و افعال میں ایک موزون ترتیب قائم رکھے۔ یہ شرطیکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرے۔“

جس صراحت کے ساتھ برکلی نے افادیت کے مہمات مبادی کو پیش کیا ہے اُس کے بعد یہ نہایت نا انصافی ہوگی اگر اس کو ملچھم اور مل کا پیشرو نہ قرار دیا جائے البتہ اس نے اپنی افادیت کو مذہبی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اس کے نزدیک کچھ نہ انسان کی

بڑی مسرت اور ابدی سعادت و بدبختی ایک برتر ہستی (خدا) کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے تمام انسانی افعال اسی کی مشیت و احکام (مذہب) کے ماتحت رہنے چاہئیں۔ اور اس کی وعدہ کی ہوئی لازوال مسرتوں کے مقابل میں دنیا کی عارضی اور قانونی لذتوں کو بیچ سمجھ کر ان پر نظر نہ ڈالنا چاہیے۔ اسی بنا پر برکے کے فلسفہ اخلاق کو مذہبی افادیت کا لقب دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے اس کی پیش روی کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔ اور ہمارے نزدیک سڈ گوک اور اسٹفن وغیرہ نے اس حیثیت سے اُس کی جانب سے بے اعتنائی کرنے میں انصاف کا خون کیا ہے۔

۶۔ سرس

یہ کتاب برکے کی علمی زندگی کی کہنا چاہیے کہ سب سے آخری یادگار اور اس کے معلومات کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ الف لیلہ کی طرح بات سے بات نکلتی چلی آتی ہے۔ اصل میں تو مارالقیہ کے طبی فوائد کی بحث شروع ہوتی ہے اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ تمام امراض کے لیے اکسیر ہے، قیر چونکہ بعض پودوں سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے نباتی زندگی کی بحث چھڑ جاتی ہے پھر نباتی ایڈجبر حیات و ارباکر علم کیمیا کے مسائل کا ذکر نکلتا ہے۔ غرض اس تسلسل کی گرفت سے تشریح، عضویات، علم المرایا، میکانک وغیرہ علوم طبعیہ کی کوئی شاخ نہیں بچ سکی۔ یہاں تک کہ بالآخر البعد الطبیعیات کے مباحث پیدا ہوتے ہیں، جن کی لپیٹ میں تمام قدیم فلاسفہ کے مذاہب ایک ایک کر کے آجاتے ہیں۔ اس ساری داستان کی تان آخرین چل کر اُسی فلسفہ مبادی پر ٹوٹتی ہے، کہ تمام کائنات طبعیہ کا مبدی محض ایک فعال روح ہر سدا عالم اسی کا پرتو ہے، اور حقیقی وجود صرف اسی کا ہے۔

آخر کے حصہ میں نہایت شد و مد کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمام متقدمین فلاسفہ، فیثاغورس، پرمینیدس، فلاطون، فلاطین، وغیرہ اسی ایک مبداً روحی کے حقیقی وجود کے قائل ہیں۔ ارسطو تک کے نزدیک مادہ سے ملا کوئی جوہر جسمی نہیں ہے، نہ وہ میقراطیس یا زمانہ حال کے مادیوں کی طرح جوہر مادی کو ساری کائنات کی اصل قرار دیتا ہے، لہذا برکلی کے نزدیک ان لوگوں کی نظریات بہ نسبت ڈیکارٹ و نیوٹن وغیرہ فلاسفہ حال کے خود اس کے نظریہ سے فریب تر اور اسی لیے صحیح تر ہیں۔ فلاسفہ یونان میں وہ سب سے زیادہ جس شخص کی غلط کامیابی ہے، وہ فلاطون ہے، لکھا ہے کہ آج بھی دنیا کو فلاطون کی احتیاج ہے۔ اور اس کی تصانیف کا مطالعہ از بس ضروری ہے

سرس برکلی کے تمام نوشتجات میں ہمہ گیر واقفیت اور وسعت نظر کے لحاظ سے بے حد حیرت انگیز ہے۔ قدیم و جدید شرق (مصر) و مغرب کے حکما (سانٹسٹ) و فلاسفہ میں شاید ہی کوئی قابل ذکر نام ایسا نکلے جو اس میں نہ آیا ہو محض نام نہیں گنائے گئے ہیں بلکہ ہر شخص کے مسائل و نظریات پر عبورانہ بحث ہے۔ قبول بھی سرس سے زیادہ کسی اور کتاب کو نہیں میسر ہوا۔ ۱۶۴۲ء میں اس کا پہلا ایڈیشن نکلا۔ چند ہفتے بعد دوسرا دور بھر مئی ۱۶۴۲ء میں تیسرا ایڈیشن نکلا، اس کے بعد مصنف کی زندگی ہی میں ۱۶۴۷ء و ۱۶۵۰ء میں اور دوبار شائع ہوئی، فرانسیسی جبرین ٹیچ، اور پرتگالی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے لیکن اسکی قبولیت کا سبب الہیاتی مباحث سے بہت زیادہ ما، القیصر کی طبی تحقیقات تھی جس نے پیشہ وراطبا کے حلقہ میں رذابت اور خافت کا جوش پھیلا دیا تھا۔ یہی جوش رقابت سرس کی شہرت و اشاعت، نام کا ذریعہ بن گیا۔

برکے کا فلسفہ تصویریت

ہستی کے مست فریبین آجائو اسد عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

فلسفہ نام ہے تلاش حقیقت کا۔ حقیقت سے کیا مراد ہے؟ اور وہ کہاں ہے؟
عام آدمیوں کو عالم سنا سنا تر تیر و تجدد تمام تر کثرت و تعدد اور کثیر اختلاف و تنوع نظر آتا
ہے۔ لیکن ایک متجسس ذہن کو فوراً یہ کھٹکتا ہے کہ اس تغیر و تجدد کے اندر کوئی نہ کوئی ثبات
و قیام، کثرت و تعدد کے پردہ میں کوئی نہ کوئی وحدت اور اختلاف و تنوع کی تہ میں کوئی
نہ کوئی اشتراک و یکسانگی پنہان ہے جو ان تمام نیزگیوں کا مبداء ہے، بس یہی مبداء وہ
حقیقت ہے جسکی جستجو کے پیچھے فلاسفہ سرگردان ہیں۔ اب اصل سوال یہ ہے کہ یہ حقیقت
کہاں ہے؟ اور اس مبداء کائنات کی کیا ماہیت ہے؟ اسی سوال کے مختلف جوابات
نے فلسفہ کے سیکڑوں فرقے پیدا کر دیے۔

عالم کے بے شمار موجودات میں دو چیزیں ایسی ملتی ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ
سے ایک دوسرے سے بالکل متخالف بلکہ متباہن معلوم ہوتی ہیں۔ ایک کے خصوصیات
میں شعور، ادراک، ارادہ اور فکر وغیرہ داخل ہے، جس کو ذہن، نفس، روح، انا، اور
ایتیو کے متعدد ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسرے کے خصائص امتداد (طول عرض
و عمق) شکل (مربع، مثلث، مدور و مستطیل وغیرہ ہونا)، حرکت وغیرہ ہیں۔ اس کو جسم یا مادہ

کہا جاتا ہے۔ جو فکر و ادراک سے اسی طرح عاری ہو جس طرح اول الذکر شکل و امتداد سے مبرا ہے۔

مادہ میں شعور و ادراک کا فرض کرنا اتنا ہی ناقابل تصور نظر آتا ہے، جتنا نفس کی ماہیت سے اُس کو مجہد کرنا، علیٰ ہذا نفس کو متحد و متشکل ماننا اسی قدر نامکن لتخیل معلوم ہوتا ہے۔ جتنا کہ مادہ کو شکل و امتداد سے منفصل کرنا۔ اسی لیے ایک جماعت کثیر یہ قبول کرنے پر مجبور ہو گئی کہ عالم کا خمیر روح اور مادہ دو مختلف الماہیت عناصر سے تیار ہوا ہے اسی دونوں کے قائل فرقہ کا اصطلاحی نام تنوید ہے جس کے علمبردار ارسطو، اور ڈیکارٹ وغیرہ ہیں۔ لیکن انسان کی فکر مضطرب اس دونوں پر بھی نہیں قرار پڑ سکتی۔ لہذا ایک طرف تو نہایت بلند آہنگی سے ایک گروہ نے یہ دعویٰ کر دیا کہ سارا عالم صرف ذرات مادی کا جلوہ گاہ ہے۔ مادہ کے ماوراء کسی اور شے کا مطلق وجود نہیں، ادراک و ارادہ وغیرہ کے افعال جنکو تم ایک غیر مادی ہستی (روح) کی جانب منسوب کرتے ہو، وہ ذرات مادی ہی کی ایک خاص ترکیب اور باہمی تاثیر و تاثر کا ایک کرشمہ ہیں۔ یہی فرقہ مادیین کے نام سے پکارا جاتا ہے، جس کے دلیل و مقدمات پس منظر وغیرہ ہیں دوسرے سرے پر اس کے بالکل خلاف روحیین اسکے مدعی ہیں کہ حقیقی وجود فقط نفس یا روح کا ہے۔ بانی جس شے کو مادہ اور جسم کہا جاتا ہو وہ محض روح کا ایک فعل یا فعل اور پرتو ہے، روحیین اور مادیین کا مشترک لقب وحدیہ ہو، ہائے برکے کا اسی آخر الذکر مذہب یعنی روحیت کے اکابر ائمہ میں شمار ہے۔ اس مذہب کا وسیع ترین نام انگریزی میں امیڈیٹزم ہے۔ جس کی تحت مین روحیت کے تمام باہم لے ایسویں صدی کا مشہور مادی جو کچھ ہو بس سب مادہ ہی کا کرشمہ ہر خدا اور روح وغیرہ منہ خرافات ہیں۔

مختلف و متباہ نظریات داخل ہیں جنہیں بالعموم نہایت غلط سمجھ کر دیا جاتا ہے۔ ہم ہر کل کے نظریات اور اس کے مرتبہ کو اچھی طرح اجاگر اور نمایان کرنے کے لیے ایڈیٹرز کو دو اصولی اسکولوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) اگرچہ کائنات کے گونا گون تغیرات و حوادث کا حقیقی سرچشمہ صرف ایک غیر مادی ہستی یا روح ہے۔ لیکن یہ حوادث و تغیرات ادراک کرنے والے نفس یا ذہن سے باہر مستقلاً موجود ہیں۔ ان کا وجود نفس مدرکہ کے ساتھ اس طرح نہیں وابستہ ہے جس طرح درد کا وجود درد کے احساس کرنے والے ذہن کے ساتھ ہوتا ہے۔ فلاطون اسپنوزا، ابنز، وغیرہ کی ایڈیٹرز کا یہی منشا ہے۔ فلاطون کے نزدیک ہمارے محسوسات کی حقیقت اگرچہ اس سے زیادہ نہیں کہ وہ غیر مادی اور غیر محسوس روحی مُثُل کے محض اشباح و اظلال ہیں۔ لیکن ان اشباح کا وجود و عدم احساس ذہنی پر مبنی نہیں، اسپنوزا بھی گو اس بات کا قائل ہے کہ جسم و روح دو مختلف و مستقل جوہر نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک تیسری روحانی ہستی (خدا) کے دو صفات یا مظاہر ہیں جنہیں سے ایک کا مابہ الامتياز امتداد ہے اور دوسرے کا فکر جس کا یہ مطلب نہیں کہ امتداد کا وجود منکر کے ماتحت ہے۔ اسی طرح ابنز نے دیمقراطیس کے ذرات مادی کے بجائے اجسام کو غیر متمد، بسیط، ناقابل اقسام، لیکن ذی ادراک موناڈس (وحیات وحی) میں تحلیل کرنے کی کوشش کی، مگر یہ نہیں دعویٰ کیا کہ اجسام کا وجود احساس سے زیادہ نہیں یا کسی جسم کا احساس ہی اس کا وجود ہے۔

(۲) انسان کو کسی صاحب ادراک ذی ارادہ اور غیر متمد و غیر متشکل ذات (روح) کے وجود کا خیال پیدا کیونکر ہوا؟ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے، یعنی خود اپنے

ذہن یا نفس کے افعال و خواص کا مطالعہ کرنے سے۔ اس لیے ایک دوسری صورت
روحیت یا اسٹڈیزم کی یہ تھی کہ تمام محسوسات (بہ الفاظ دیگر موجودات مادی) کو محض
اپنے ہی نفس کے مختلف کیفیات و حوادث قرار دیا جائے۔ اور چونکہ انسان کو بالذات
دو براہ راست صرف اپنے ہی تصورات یا حوادث ذہنی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ لہذا یہ نظریہ
روحیت زیادہ قریب الفہم اور زیادہ قابل قبول تھا۔ اور برکے کے نزدیک تو یہ اُن
حقائق میں داخل ہے جو ذہن سے اس قدر قریب اور اس قدر بدیہی ہیں کہ ان کے
دیکھنے کے لیے آدمی کو صرف اپنی آنکھیں کھولنے کی ضرورت ہے؛ لیکن پھر بھی خبر برکے
سے پہلے کسی شخص کو اس نے نقاب حقیقت کے مشاہدہ کے لیے چشم کشائی کی توفیق
نہ میسر ہو سکی۔ ہم اسٹڈیزم کی سابق الذکر صورتوں سے ممتاز کرنے کے لیے برکے کے نظریہ
کا نام **تصویریت یا تصویری اسٹڈیزم** رکھتے ہیں۔

اگرچہ فلسفہ کی اس حقیقت عظیم کے اکتشاف اور اسکی تکمیل دونوں کا فرزند ہا برکے کو
حاصل ہے۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے جس نے سب سے اول راہ کھولی وہ
سوفسطائیہ کا مقدمہ الجیش پروٹاگورس ہے ڈیکارٹ کو کہ صرف پہلا قدم بڑھا کر بے راہ
ہو گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تاریخ تصویریت کا یہی سب سے اہم قدم تھا، جسکے بعد لاک
آدھارا راستہ طے کر لیا۔ لیکن اصل نکتہ تک پہنچنے میں صدیوں کے تعصبات کی آہنی دیوار
حائل ہو گئی۔ اس کے ٹوڑنے کے لیے فقط ایک مجتہد دماغ اور جبری قلب کی حاجت تھی
جو برکے قدرت سے لیکر آیا تھا۔ اور جس کے آثار بچپن ہی سے نمایان تھے۔ لہذا برکے
کے تاریخی مرتبہ اور اُس کے مجتہدانہ اکتشاف سے پوری طرح واقف ہونے کے لیے
بے ناگزیر ہے کہ پہلے اجمالاً پروٹاگورس، ڈیکارٹ، اور لاک کے نظریات سے مطلع ہونچا جائے۔

پروٹاگورس (۴۲۰ ق م) سے پہلے فلاسفہ ذہنی شعور کو موجودات خارجی کا ماتحت قرار دیتے تھے، اس نے اس اصول کو باطل الٹ دیا۔ ایک ہی چیز کی نسبت مختلف لوگوں کے مختلف احساسات ہوتے ہیں؛ بلکہ ایک ہی شخص مختلف اوقات و حالات میں مختلف وقتاً بہ کیفیات محسوس کرتا ہے، لہذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ذہن سے باہر محسوسات کا کوئی مستقل وجود نہیں؛ بلکہ ہر چیز اور اک ذہنی پر منحصر ہے۔ انسان اپنے ارادات کے مدار پر کچھ نہیں جانتا۔ جو چیزیں ہمارے احساس کے دسترس میں نہیں ہیں وہ ہمارے لیے موجود ہی نہیں۔ جزییات محسوسہ کے علاوہ کسی فتنے کا اثبات ناممکن ہے جس چیز کا کوئی آدمی نہیں اور اک کرنا اس کا کوئی وجود نہیں۔ خلاصہ یہ کہ تمام چیزوں کا معیار انسان (ذہن انسان) ہے۔ یہ خط زدہ اصول موضوعہ اور اوپر کے مندرجہ فروع صرف ہر شے کی صورت کی بنیاد ہیں؛ بلکہ ہر شے کی ارتباطیت اور کیفیت کی انتہا دیتے ہیں انہی کی تین بنیادیں ہیں۔

ڈیکارٹ (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء فرانس) نے اسی بنیاد کو زیادہ کمال اور حکیمانہ بنا دیا۔ اُس نے کہا کہ تمام ان چیزوں کو جن کا ہم کامل وضاحت اور تصدیق کے ساتھ تصور نہیں کر سکتے۔ عدم یقین اور شک کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ صرف ان چیزوں کو قبول کرنا چاہیے جن کا وجود ہمارے لیے بالکل نمایاں اور برہین ہے۔ اس معیار پر صرف اپنا یعنی ایک سوچنے اور خیال کرنے والی ذات کا وجود قطعی اور یقینی رہ جاتا ہے۔ کیونکہ ہم اجسام کے تمام خواص و صفات یعنی امتداد و شکل وغیرہ کے وجود خارجی پر شک کر سکتے ہیں۔ لیکن خود اپنے اندر کے خیال یا فکر کا انکار کسی طرح نہیں کر سکتے۔ کہ انکار یا شک بھی تو خیال کرنا ہی ہے۔ لہذا تمام مادیات

فکر اشیا سے انکار کرنے پر بھی نفس فکر کا وجود برہمی اور ناقابل انکار ہے بس کم از کم
 اتنا قطعی ہے کہ میں ”سوچتا ہوں لہذا میں ہوں“ یعنی میری ہستی سوچنے والی اور خیال
 کرنے والی ذات سے عبارت ہے۔ اور اسی کا نام ذہن نفس عقل و روح وغیرہ
 ہے جس کا خود بالذات اور براہ راست واضح ترین علم حاصل ہے، لیکن آگے چل کر
 ایک دقیق منطقی مغالطہ سے دھوکا کھا کر ڈیکارٹ خود اپنے ہی اصول سے بھٹک گیا۔ طح
 ہمارے لیے فکر و خیال کا تصور نہایت واضح اور صاف ہے، اُسی طح استدلال و شکل کا
 تصور بھی بین طور پر موجود ہے۔ اور جسطح فکر و خیال، کسی فکر و خیال کرنے والی
 ذات کو منسلک ہے۔ اسی طح شکل و استدلال کسی شکل و متد چیز کو متضمن ہے، وہی مادہ
 ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روح کی طح مادہ کا وجود بھی یقینی اور واضح ہے
 روح کلبے فکر کے اور مادہ کلبے استدلال کے تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا فکر و استدلال
 علی الترتیب روح اور مادہ کے صفات ذاتی ہیں جو باہم بالکل متضاد اور ایک دوسرے
 سے الگ مستقل بالذات موجود ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر دوسرا نتیجہ ہے۔ یعنی یہ کہ
 ہمارے ذہن میں کمالیت اور نامحدودیت کے تصورات بین طور پر پائے جاتے ہیں
 جن کو خود ہمارا ذہن نہیں خلق کر سکتا۔ کیونکہ وہ ناقص و محدود ہے۔ لہذا لازماً وہ کسی
 کامل اور نامحدود ذات کے آفریدہ ہیں اور وہی خدا ہے۔

لاک (۱۶۳۲ء تا ۱۷۰۴ء انگلینڈ) نے تصویریت کے دو اہم اور بنیادی اصول
 نہایت صراحت کے ساتھ قبول کر لیے (۱) ذہن کے پاس فکر و استدلال کے لیے بجز خود اسکے
 ذاتی تصورات کے اور کوئی شئی نہیں ہے۔ لہذا ہمارا علم تا ستر انہی تصورات ذہنی تک
 محدود ہے۔ یعنی ذہن کو خود اشیا سے خارجی کا براہ راست علم نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ جو کچھ

جانتا ہے۔ محض اپنے تصورات کی وساطت سے (۲)۔ کسی جوہر جسمی یا مادہ کا تصور ہمارے لیے اُسی قدر بعید انعم ہے جیسا کہ کسی جوہر روحی یا روح کا؛ بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ امتداد شکل صلابت وغیرہ جن کا انسان کو حواس سے ادراک ہوتا ہے، یہ محض اعراض یا صفات ہیں جو ایک غیر محسوس محل یا جوہر جسمی کے ساتھ قائم ہیں۔ یہی محل اعراض یا جوہر جسمی مادہ ہے۔ لاک کے نزدیک اس قسم کے مادہ کا وجود قطعاً ناقابلِ فہم ہے اور موجودات خارجی محض اعراض یا صفات محسوسہ کا مجموعہ ہیں۔

ان صفات محسوسہ کی دوہین ہیں اولیٰ اور ثانوی جبکہ ہم علی الترتیب حقیقی اور غیر حقیقی کہیں گے۔ حقیقی سے مراد وہ صفات ہیں جو خارج میں ذہن سے باہر موجود ہیں۔ اور حواس پر ان کا اسی طرح انعکاس ہوتا ہے جس طرح کسی شے کا آئینہ پر امتداد، شکل، حرکت و سکون اور عدد اسی قسم کی تحت میں داخل ہیں۔ باقی رنگ، روشنی، ذائقہ، آواز، بو، حرارت و برودت غیر حقیقی صفات ہیں یعنی ان کا وجود ان کے احساس کرنے والے ذہن سے باہر نہیں ہے، چنانچہ اگر کوئی چکھنے، سونگھنے، اور سننے والی ذات نہ موجود ہو تو ذائقہ اور آواز کا بھی سرے سے کوئی وجود نہ ہوگا۔ بالکل اُسی طرح جیسے در بنیہ در محسوس کرنے والے کے نہیں پایا جاسکتا۔ ان تصورات کی بنا پر جو آگ کا ایک انگارہ، برت کا ٹکڑا اور مین ہمارے اندر پیدا کرتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ انگارہ گرم و روشن، برت سفید اور سرد اور مین سفید و شیریں ہے۔ ان صفات کی نسبت عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اجسام بعینہ اسی طرح موجود ہیں جس طرح ہمارے ذہن میں اور ایک دوسرے کا دیا ہی مثل مثلاً جیسا کہ آئینہ کا عکس اور اصل

لے فہم انسانی۔ کتاب ۲۔ باب ۲۳ بندہ ۵۔

شے۔ اگر کوئی شخص اُس کے خلاف کئے تو وہ بہت سے لوگوں کو نہایت ہی عجیب معلوم ہوگا تاہم جو آدمی اسپر غور کرے گا کہ جو آگ ایک خاص فاصلہ پر رہ کر ہمارے اندر گرمی کا احساس پیدا کرتی ہو وہی قریب آکر تکلیف یا درد کا ایک بالکل مختلف احساس پیدا کرتی ہو۔ اسکو اپنے ذہن میں سوچنا چاہیے کہ یہ کہنے کے لیے اس کے پاس کیا حجت ہے کہ گرمی کا تصور جو آگ نے اس میں پیدا کیا ہے وہ تو واقعاً آگ میں پایا جاتا ہو۔ اور تکلیف کا تصور جو اسی آگ نے اسی طریقہ سے پیدا کیا وہ خود اس آگ میں نہیں ہے۔ اسی طرح کے تخیلی دلائل کی مدد سے رنگ ذائقہ بو وغیرہ دوسرے صفات ثانوی کی نسبت بھی یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ان کا وجود ذہن سے الگ نہیں ہے۔ لیکن چونکہ یہ مسئلہ نہ صرف لاک کے نزدیک بلکہ تقریباً تمام حکما (سائنٹسٹس) اور خود ماورئین میں مسلم ہو چکا ہے اس لیے ہم خوفِ طوالت یہاں اسکی تفصیل کو نظر انداز کرتے ہیں۔

یہ تسلیم کر چکنے کے بعد کہ جسم کو براہِ راست صرف اپنے ذہنی تصورات کا علم ہو اور یہ تصورات جن موجود فی الخابج صفات حسی سے ماخوذ ہیں وہ کسی غیر محسوس عل جوہری (مادہ) کے ساتھ نہیں قائم ہیں۔ نیز ہمارے محسوسات کا بڑا حصہ (صفات غیر حقیقی ذہن سے باہر مطلقاً نہیں پایا جاتا۔ اور ان کی حقیقت احساسات ذہنی سے زیادہ نہیں اب تصویریت کی تکمیل کے لیے صرف اسکی ضرورت تھی کہ صفات غیر حقیقی کے حکم کو وسیع کر کے صفات حقیقی کو بھی انہی میں داخل کر دیا جائے۔

برہ کلمے نے یہی کیا۔ یعنی صفات حقیقی اور غیر حقیقی کی تفریق اٹھا دی۔ جب یہ پوری طرح محقق اور مسلم ہو چکا ہے کہ باصرہ، سامعہ، ذائقہ اور شامہ تمام آلات جس کے محسوسات

محض ذہنی ہیں، جن کا احساس کرنے والے سے باہر کوئی وجود نہیں، تو پھر صرف ایک حاسہ لمس کے محسوسات کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے۔ اگر یہ قطعی ہے کہ ہم کو صرف اپنے تصورات ذہنی کا علم ہے تو پھر یہ کہنا بالکل بے معنی ہے کہ رنگ مزہ بو، اور آواز وغیرہ کے تصورات تو محض تصور کرنے والے ذہن کی مختلف کیفیات ہیں۔ لیکن استدلال اور حرکت وغیرہ کے تصورات موجود فی الخابج چیزوں کا عکس یا نشی ہیں۔ اس کے علاوہ صفات اولیٰ کے تصورات کا صفات ثانوی کے تصورات سے الگ کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کر سکتا کہ استدلال کا بے کسی کسی رنگ کے تصور کر سکے۔ لہذا جہان رنگ کا وجود ہے وہی استدلال کا بھی ہونا چاہیے۔ یعنی ذہن میں اس امر کو وضاحت کے ساتھ دلنشین کرانے کے لیے کہ صفات حقیقی اور غیر حقیقی یا اولیٰ اور ثانوی کی تفریق محض بے بنیاد ہے، ہم ایک مثال سے مدد لیتے ہیں جس پر غور کرنے سے اصل حقیقت بالکل کھل جاتی ہے۔

ایک پیدائشی اندھے کی ہتھیلی پر زور سے ایک بیدار تو اس کے ذہن میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوگی جسکو درد یا تکلیف کے احساس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ احساس صرف اُس کے ذہن میں پایا جاتا ہے نہ کہ بیدار کے ساتھ ہی اس بیدار ہتھیلی کے تصادم سے ایک اور احساس بھی پیدا ہوگا جسکا نام آواز ہے۔ یہ آواز بھی محسوس کرنے والے ذہن ہی کی ایک کیفیت ہے کسی ایسی شے کا ٹٹنے یا مثال نہیں جو ذہن سے باہر بیدار ہتھیلی میں موجود ہے۔ اب تم اس بیدار کو کہتے ہو اس اندھے کی ہتھیلی پر کھو تو درد اور آواز سے بالکل مختلف ایک حالت ذہن میں پیدا ہوگی جسکو احساس لمس کہا جاتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے، کہ یہ

احساسِ مس کی حالت احساس کرنے والے باہر بید میں پائی جاسکتی ہے۔ اب ذرا اسی بید کو اس کی پتھیلی پر پھراؤ تو ایک نیا احساس پیدا ہوتا ہے جسکو دہرہ سرراہٹ کہتا ہے، انصاف سے بتاؤ کہ کیا سرراہٹ بھی اسی طرح محض ذہن کا ایک احساس نہیں جس طرح مس تھا۔ اسی سرراہٹ کے حس ہی کا دوسرا نام تو حرکت ہے جس کو کوتاہ نظری سے صفات ثانویہ سے الگ کر کے خواہ خواہ صفت اولیٰ کا لقب دیا گیا ہے۔ اس تجربہ کو ابھی اور ذرا وسیع کرو، اور اس اندھے سے کہو کہ بید کو اپنے ہاتھ سے ٹٹولے اور ٹٹھی میں دباوے، تو درد اور بالکل جدید کیفیات محسوس ہونگی جن کا نام بید کی لمبائی (استداد) اور گولائی (شکل) ہے۔ یہ دونوں بھی احساسِ مس ہی سے ماخوذ بلکہ اسی کی مختلف صورتیں ہیں اسی مثال پر ذرا دھیان رکھنے سے یہ بالکل روشن ہو جاتا ہے کہ کم از کم لمسِ استداد، شکل، حرکت وغیرہ کی حقیقت تو درد، آواز، لمس وغیرہ کی طرح محض ذہنی حس ہے۔ اور ان کے وجود خارجی کا اذعان و اثبات سرراہٹ اور مس کا براہ ہے۔

اصلی دوسرے اجوشیا کے وجود خارجی کے اعتقاد کو دل سے نہیں نکلنے دیتا، وہ استداد، شکل، حرکت وغیرہ کی مرمت یا حسِ بصری ہے نہ کہ حسِ لمسی۔ اس کھٹک کو کیا کیا جائے کہ ہم کو اپنے ذہن سے باہر مختلف قد و قامت اور مختلف شکل و صورت کی چیزیں علانیہ مختلف فاصلوں پر حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ رنگ بھی ہم کو علانیہ ذہن سے باہر نظر آتا ہے، حالانکہ اس کو کوئی بھی موجود فی الخارج نہیں سمجھتا۔ لیکن تحقیقی جواب وہ ہے جسکے لیے برکے نے مبادی سے پہلے جدید نظریہ رویت لکھا تھا جسکا تفصیلاً اوپر ذکر گذر چکا ہے اور یہ ثابت کیا جا چکا ہے،

کہ استدلال وغیرہ کو مرئی خیال کرنا محض التباس حواس ہے۔ اس سے بھی قطع نظر کر کے
 یہ کہا جاسکتا ہے کہ چیزوں کا مختلف طول و عرض و اشکال و حرکات کے ساتھ مختلف
 فاصلوں پر نظر آنا بھی تو ایک احساس ہٹنی لیس کا نہ سنی بصر کا سنی اور احساس
 کا بغیر کسی احساس کرنے کے یا اُس سے باہر موجود ماننا کیا ایک بین تناقض نہیں ہے؟
 رہا یہ خدشہ کہ استدلال و حرکت، شکل وغیرہ صفات یا اعراض ہیں جن کے قیام کیلئے کسی
 محل جوہری کا ہونا لازمی ہے، تو اولاً تو یہ لزوم فلاسفہ کا ایک بے دلیل فرضی ٹھکوسلا
 ہے جسکی بنا اُسی غلط نظریہ تجرید پر ہے۔ ثانیاً یہ کہ خود ذہن ہی کو کیوں نہ وہ محل جوہری
 قرار دیا جائے، جسکے ساتھ استدادات کا وغیرہ کا احساس اُسی طرح قائم ہے جس طرح
 غم، غصہ، لذت و الم وغیرہ کے احساسات۔ اس کے ماسوا، جس طرح عام خیال یہ ہے کہ
 نفس اور جسم دو بالکل مستقل اور الگ الگ قائم بالذات چیزیں ہیں اور جسم جب آلات
 حس پر عمل کرتا ہے تو نفس میں احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسری صورت یہ
 ہو سکتی ہے کہ خود نفس ہی میں ایسی قوت موجود ہو کہ بلا کسی خارجی اعانت کے کمال ترتیب
 انضباط کے ساتھ احساسات کو اپنے اندر خلق کرتا رہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت کے
 فرض کرنے میں کوئی استحالہ نہیں ہے، اور اس صورت میں بھی تم خارجی محل جوہری کے وجود
 پر تمام وہ دلائل پیش کر سکتے تھے، جواب کرتے ہو، حالانکہ اُس وقت یہ دلیلین واقع کے
 قطعاً خلاف ہوتیں، غرض احساسات ذہنی کی تخلیق کے لیے خارج از ذہن جو چیزیں یا
 صفات محسوسہ کے لیے محل کا وجود ماننا کسی ناقابل انکار استدلال پر نہیں مبنی ہے۔

اور برکلمے کی تصویریت کا اصل یہ ہے کہ تمام وہ چیزیں جن کا بالذات وبراہ راست
 حواس سے علم ہوتا ہے، وہ اسی طرح محض ہمارے تصورات ذہنی ہیں جس طرح حافظہ

اور تخیل کے آفریدہ احساسات ثانیہ مثلاً اس وقت جو کتاب تمہارے ہاتھ میں ہے،
 اس کی مخصوص شکل و صورت کو براہ راست اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہو، لیکن کسی دوسرے
 وقت جب یہ کتاب سامنے نہ ہو، تب بھی حافظہ یا تخیل کی مدد سے تم اس کی اُس مخصوص
 شکل و صورت کا اپنے ذہن میں تصور باندھ سکتے ہو۔ عام خیال کے مطابق کتاب کا پہلا
 تصور ایک خاص مادی اور ذہن سے باہر موجود فی الخارج کتاب کا پیدا کیا ہوا ہے، اور
 دوسرا محض ذہنی ہے۔ مگر یہ کلمے کے نزدیک دو نون محض ذہنی ہیں۔ فرق صرف اتنا
 ہے کہ پہلا زیادہ واضح، مرتب و منضبط ہوتا ہے اور ہمارے ارادہ کا تابع نہیں ہوتا۔ یہ نہیں
 ہو سکتا، کہ ہم آنکھ کھولیں اور ہمارے سامنے رکھی ہوئی کتاب کا دیکھنا یا نہ دیکھنا ہمارے اختیار
 کی بات ہو بچکان اسکے جب یہ کتاب سامنے نہ ہو تو حافظہ کی مدد سے اسکے احساس ثانی کا تصور
 پیدا کرنا، نہ کرنا ہمارے اختیار و ارادہ پر منحصر ہے۔ اسی فرق کی بنیاد پر ادل الذکر قسم کے تصورات
 کو صلی اور حقیقی کہا جاتا ہے، اور ثانی الذکر کو متناہی اور غیر حقیقی فلسفہ طبیعی (دبچل فلاسفی) کا
 کام ان ہی تصورات ادلی کی ترتیب دائضبط کا مطالعہ ہے۔ اس مطالعہ اور پیہم تجربات سے
 ان تصورات کے اندر جن باہمی علایق کا مجموعہ ملتا ہے، انہی کا نام قوانین فطرت
 (لازآف نیچر) ہے، ان علایق میں سب سے اہم وہ علاقہ ہے جسکو علت و معلول کے
 نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جسکی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ ہم کو تجربہ یہ بتلا دیتا ہے
 کہ فلان فلان تصورات کے بعد فلان فلان دوسرے تصورات ذہن پر طاری ہونگے
 مثلاً کھانا کھانے کے تصور کے بعد آسودگی یا کرب و غم کے زوال کا تصور نیز کے بعد
 نازگی کا تصور، آگ کے بصری احساس یا تصور کے بعد گرمی کا لمسی احساس یا تصور،
 وغیرہ ذالک، خلاصہ یہ کہ عام طور پر حکما فلسفہ طبیعی یا سائنس کا موضوع مادہ کے خواص

واقعات کی تحقیق سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت حکمیات کے تمام شعبوں کا تعلق تصورات کے محض باہمی علائق سے ہے، جن کے مطالعہ کے لیے فلاسفہ کے محل جوہری کا نامنا مطلق ضروری نہیں۔

اس موقع پر برکے کی نسبت ایک عام غلط فہمی کو اچھی طرح رفع کر لینا چاہیے جو سپر اسکے مخالفین کی مضحکہ خیز لیون کی بہت کچھ بنیاد ہے، انسان کے تمام معلومات کا اصلی سرچشمہ جیسا کہ لاک نے کہا ہے، صرف حواس ہیں اس لیے اگر ان کی شہادت پر سے اعتماد اٹھالیا جائے، تو پھر ہمارے خزانہ علم میں صرف کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ دریا، پہاڑ، مکان، درخت، حیوانات، خود اپنا جسم، غرض دنیا کی تمام چیزوں کا حواس اور صرف حواس سے علم ہوتا ہے، برکے کے اس کہنے سے کہ یہ تمام محض انسان کے تصورات ذہنی ہیں، یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ شہادت حواس کی تکذیب کرتا ہے، اور اس لیے دنیا کو حقیقی چیزوں کے وجود سے محروم کر کے ساری کائنات کو محض ایک خیالی طلسم خانہ بنا دینا چاہتا ہے ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ نمخرا نگیز اور دیوانہ پن کی اور کیا بات ہو سکتی ہے لیکن دراصل یہ اُن لوگوں کا احراض ہے جنہوں نے انکھیں کھول کر بادی با کمالات ہکس کے پڑھنے کی زحمت نہیں گوارا کی بلکہ سنی سنائی باتیں لے اڑے، ورنہ درحقیقت جو الزام تم اُس پر لگا رہے ہو، وہ اٹے اس کا مجرم اپنے حرفیوں کو قرار دیتا ہے، وہ صرف انہی چیزوں کو حقیقی اور واقعی تسلیم کرتا ہے جبکا براہ راست آلات حس اور صرف آلات جس سے ادراک ہوتا ہے، البتہ عام فلاسفہ اور حکما حواس پر بھروسہ نہ کر کے محسوسات کے ماوراء ایک سرتر اسر غیر محسوس اور نامعلوم شے کا وجود مانتے ہیں، جس کو مادہ جوہر محل، ہیولی، خدا جانے کن کن ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ ع، خواب نذیرہ راہمہ تبصر می کنند

انہیں یہ ہے کہ اسی ندیدہ کا نام اصل اور حقیقت رکھنے ہیں، اور برکے پر وہ بتاؤ کہتے ہیں جو خود پر چھایا جاتا ہے اب سنو کہ برکے کیا کہتا ہے ”وہ چیزیں جن کو میں آنکھوں سے دیکھتا اور ہاتھوں سے چھوتا ہوں، وہ موجود ہیں، حقیقتاً موجود ہیں، ان کے وجود میں مجبوز وہ بحر بھی شبہ نہیں جس چیز کا میں منکر ہوں، وہ صرف وہ ہے جسکو فلسفی مادہ یا جوہر جی کہتے ہیں، اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہم چیزوں سے واقفیت یا وجود کو چھین لیتے ہیں تو وہ جو کچھ کہا گیا ہے مطلق نہیں سمجھا۔۔۔“

اگرچہ تنوید کی طرح برکے کائنات کی تعمیر کے لیے مادہ اور روح دو مختلف المانہتہ ضروری نہیں خیال کرتا اور اس حیثیت سے وہ وحدیہ کے زمرہ میں داخل ہے، لیکن ایک دوسری حیثیت سے، وہ تنویدی نہیں بلکہ تشکیلی ہے، یعنی عدداً وہ تین چیزیں الگ الگ مانا ہے۔ تصورات حسی، نفس، جو ان تصورات کا ادراک کرتا ہے اور روح برتر جو ان تصورات کو نفس پر برسم بطاری کرتی ہے عرف عام میں انہی تینوں کو بالترتیب پنجر (موجودات حسی)، ذہن انسانی، اور خدا کہا جاتا ہے یہی تثلیث برکے کے نظام فلسفہ کا سب سے کمزور اور ناقابل حمایت حصہ ہے۔ یہ ٹھوکر محض اس نے اپنے مذہبی غلو اور جوش کی بدولت کھائی ہے۔

بہ ظاہر یہ ایک بالکل بے بسی بات معلوم ہوتی ہے کہ جب تصورات و ادراکات کا وجود ناقابل انکار ہے تو پھر لامحالہ کوئی تصور و ادراک کرنے والی ذات بھی ہونا چاہیے، وہی ذہن، نفس یا انسان ہے، یہ بہ لحاظ اپنی حقیقت کے اسی طرح ایک جوہر روحی یا غیر مادی ہستی ہے جس طرح خدا۔ فرق یہ ہے کہ یہ مخلوق ہے، اور خدا خالق، لیکن ایک بار مخلوق

ہونے کے بعد اب یہ ہمیشہ کے لیے ناقابلِ فنا ہے۔ یہ نفس چونکہ تصورات کا حامل اور اُن پر عامل و متصرف ہے، اس لیے گویا اسکی حقیقت میں فاعلیت داخل ہر باقی تصورات تو محض شفعل ہیں۔ لہذا خود اپنے نفس کا تصور نہیں ہو سکتا، ورنہ پھر وہ بھی بجائے فاعل کے منفعل اور تصور کرنے والی ذات کی جگہ خود ایک تصور بن جائیگا۔ اس بنا پر اس نفسِ مدرک کا علم ہکو اپنے تصورات سے محض استنباطاً حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی استنباطی علم کا نام برکھ نے درک (نوشن) رکھا ہے۔ اب ہم دریافت کرتے ہیں کہ کیا، ادراکات اور تصورات سے معرا کر لینے کے بعد ہستی مدرک کے ہم کچھ بھی معنی سمجھ سکتے ہیں؟ کیا انکارِ دادراکات کے تسلسل کے اسو نفس کی کوئی اور اہمیت ثابت کیجا سکتی ہے؟ اور کیا تسلسلِ افکار و احساسات سے مجرد کر کے الگ ایک جوہرِ روحی کا وجود قبول کرنا اس سے کچھ قطع تر ہے، جتنا، صفات محسوسہ سے مجرد کر کے جوہرِ جسمی (مادہ) کا منشا؟ کیا فکر و ادراک سے مسلوب نفسِ مادہ کی طرح ایک مہل اور بے مفہوم لفظ نہیں ہو؟ ان تمام سوالات کے جواب میں ہکو انفس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ برکھ نے نادانتہ تجرید کے اسی گناہِ عظیم کا مرتکب ہوا ہے جس سے احتراز کو اُس نے اپنے فلسفہ کا سنگِ اساس قرار دیا تھا۔ اور جسکو وہ اپنے تمام پیشروں و فلاسفہ کی گمراہی کا منشا و حیدلقین کرتا ہے۔

روح برتر یا خدا کے وجود کا استدلال اس سے بھی کم مایہ ہے، جو تصوراتِ براہِ راست حواس کی وساطت سے حاصل ہوتے ہیں چونکہ ان کا پیدا اور فنا کرنا ہمارے قدرت و اختیار سے باہر ہے لہذا انکی آفرینش کے لیے کوئی اور صاحبِ ارادہ اور انسانی اذہان سے وسیع القدرت ذات ہونی چاہیے اور چونکہ یہ تصورات حسی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اور مقررہ اصول کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں اس لیے وہ ذات حکیم بھی ہو، وگرنہ انک

واحد غیر منقسم، فعال، ازلی، ابدی وہ تمام اُن صفات کی جامع ہے جو ایک کامل ترین
 ہستی میں پائی جانی چاہیں اور لا تو بہ قول مل کے یہ کہنا صحیح نہیں کہ تصورات حسی کے
 علاوہ باقی تمام تصورات انسان کے ارادہ کے تابع ہیں۔ سیکڑوں خیالات ہمارے ذہن
 میں بلا ہماری خواہش اور ارادے کے پیدا ہوتے رہتے ہیں بلکہ اگر ہم انکو دور کرنا چاہتے ہیں
 تو نہیں کر سکتے، لہذا جب انکی آفرینش کے لیے کسی برتر روح کی احتیاج نہیں تو تصورات
 حسی کی کیا تخصیص ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر تصورات کی خلقت کے لیے کسی سبب کا ہونا
 ناگزیر ہے تو پھر ہم اُسی مادہ کو کیون نہ مان لیں کیونکہ جس طرح صفات محسوسہ سے منفصل کر کے
 مادہ کا وجود ہمارے لیے ناقابل فہم تصور ہو جاتا ہے، اُسی طرح خدا کو جن صفات سے
 متصف یا منزہ بتلایا جاتا ہے، مثلاً ناقابل احساس غیر محمد و غیر مخلوق، ہر جا موجود
 وغیرہ، ان کی حامل ذات کا بھی ہماری سمجھ میں آنا قطعاً ناممکن ہو رہی یہ بات کہ بہ نسبت
 کسی بے حس ادراک ہستی کے ایک صاحب قدرت و ذی ارادہ ہستی کو خالق تصورات
 ماننا زیادہ قرین قیاس ہے، ایک غیر ثابت اور بحث طلب سلسلہ ہے، البتہ اس قیاس
 کی صحت کے نفس امکان یا امکان مرجع سے بجز جاہل ملاحظہ کے کوئی فہمیدہ آدمی انکار
 نہیں کر سکتا ایک دوسری دلیل جو برکے نے وجود خدا پر قائم کی ہے وہ دراصل ان بعض
 اعتراضات کے بجاؤ کیلئے ہے جو اُس کے اصول کو قبول کرنے سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً اگر جب
 تمام محسوسات انسان کے محض ذہنی تصورات ٹھہرے تو پھر ڈرائنگ روم میں جسوقت
 کوئی آدمی تصور کرنے والا ذہن نہیں ہے، تو وہ ان فرنیچر کا بھی مطلقاً کوئی وجود نہیں
 ہے، اور جیسے ہی کوئی شخص کمرہ میں داخل ہوتا ہے، تمام چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں دوسرے
 لفظوں میں یوں کہہ کہ تمام چیزیں ہر وقت پیدا اور فنا ہوتی رہتی ہیں، کسی شے کا کوئی

مستقل اور دالمی وجود نہیں (۲) جب کسی شے کا ذہن سے باہر وجود نہیں اور مختلف
 آدمیوں کے تصورات کسی ایک وجود خارجی کا عکس نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے
 کہ بعینہ کسی ایک ہی چیز کو دو آدمی نہیں جانتے جس آفتاب کو زبردیکر رہا ہے، بعینہ
 اسی کو عمر نہیں دیکھ رہا ہے، کیونکہ اس کی مستقل بالذات کوئی ہوسیت ہے ہی نہیں یہ
 اور بات ہے کہ دونوں کے تصورات اس قدر باہم مشابہ اور مماثل ہوں کہ کوئی
 فرق نہ کیا جاسکے، لیکن وہ ایک ہی شے کے تصورات نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کے
 اعتراضات سے بچنے کے لیے برکلی نے ایک برتر روح یا ذہن (خدا) کی آوا
 میں پناہ لی۔ اگر تمام انسانی اذہان فنا بھی ہو جائیں تب بھی تمام چیزیں خدا کے ذہن میں
 موجود ہیں اور ہر شے کا ہر وقت پیدا اور فنا ہونا نہیں لازم آتا، اسی طرح زید و عمر دونوں کے
 تصورات خدا کے تصور واحد کا پرتو ہیں جبکی ہوسیت میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوتی۔
 لیکن ہمارے نزدیک فلسفہ کے نقطہ نظر سے، اُن اعتراضات ہی کی سرے سے
 کوئی وقعت نہیں۔ عام خیال کی رو سے البتہ یہ ایک بہت عجیب اور نہایت ہی متبع
 بات معلوم ہوتی ہے کہ چیزیں ہر لمحہ پیدا اور فنا ہوتی رہتی ہیں، یا زید و عمر کے ذہن میں
 آفتاب کے الگ الگ جو احساسات کو پیدا ہوتے ہیں وہ کسی تیسرے بعینہ ایک مستقل
 اور قائم بالذات آفتاب سے ماخوذ نہیں ہیں لیکن فلسفہ تعصبات عامہ کا پابند نہیں
 ہے۔ وہ اسکی مطلق پرواہ نہیں کرتا کہ اس کی تحقیقات سے دنیا کے عام عقائد اور مسلمات
 کو کیا صدمہ ہوئے گا۔ اسکی خرد وہ گیری سے حکمت و ریاضی کے مبادی کو بھی جو اپنی جگہ پر
 قطعی خیال کیے جاتے ہیں پناہ نہیں حاصل۔ لہذا وہ نہایت دلیری سے یہ دریافت
 کر سکتا ہے کہ اچھا اگر یہ چیزیں برکان پیدا اور فنا ہوتی رہتی ہیں تو رہنے والا جس آفتاب

کو دیکھ رہا ہے۔ عمر بعینہ اسی کو نہیں دیکھتا تو نہ دیکھے، اس میں قباحت اور غلی اسخا لہ کیا ہو باقی اگر عام معتقدات کا لحاظ کیا جائے تو پھر فلسفہ کو ہمیشہ کے لیے ردپوش ہو جانا چاہیے اور ہر کلمہ کو یہ کہنے کی ہرگز ہمت نہ کرنی چاہیے تھی کہ اشیا کا ذہن سے باہر مطلق کوئی وجود نہیں کیونکہ اس سے زیادہ شاید ہی کوئی اور چیز معتقدات عامہ کو صدمہ پہنچا سکتی ہو۔ اصل یہ ہے کہ ہر کلمہ نے جس فلسفیانہ جرأت سے ہزار ہا سال کے بودہ تعصبات کو چاک کر دیا تھا، اس کو وہ آخر تک نہ نباہ سکا۔ اور جس راستہ کا رہنما تھا، خود اس سے بھٹک گیا، مگر کیا کیجیے کہ یہ خود فراموشی وہ بشری کمزوری ہے جس سے بچنے کا کوئی انسان انسان رہ کر دعویٰ نہیں کر سکتا۔

ہر کلمے نے جا بجا اس بات پر نہایت وثوق و یقین اور مدعیانہ اصرار کیا ہو، اگر اس کا فلسفہ تصوریت قبول کر لیا جائے اور موجودات خارجی کے اعتقاد کو ذہن سے بحال دیا جائے تو (الف) مباحث الہیات کی بیسیوں گتھیاں جو ہزار ہا سال سے لائیکل چلی آتی ہیں از خود دا ہو جاتی ہیں اور (ب) تشکیک یا ارتیا بیت کا ہمیشہ کیلئے قدم اٹھ جاتا ہے۔ اگر دنیا کا کوئی فلسفہ بھی ایسے اہم نتائج کا ذمہ دار اور حامل ہو تو اس کی عظمت سے ذرہ بھر بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن ہم کو شک ہے کہ تصوریت کا اصول اس میں پرپورا اُترتا ہے، رہا خود ہر کلمے کا اتنا غیر خزلزل ادعا، تو وہ اس جوش اور انہماک کا عین اقتضا تھا، جو ہر کشف اعظم کو اپنے اکتشاف و اجتہاد کے ساتھ ہوتا ہے۔

بلاشبہ موجودات خارجی یا مادہ سے دست بردار ہو جانے کے بعد ان بھون کا قطعی استیصال ہو جاتا ہے کہ مادہ کی کیا حقیقت ہو؟ اس میں حیات اور فکر ہے یا نہیں؟ نہیں تو کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ وہ ذہن پر کیونکر نصرت و عمل کرتا ہے؟ قدیم ہے یا حادث؟ اس کی قسمت پذیری تناہی ہے یا غیر تناہی؟ وغیرہ الگ۔ لیکن کیا ان کے مقابل میں نفس یا

روح کے بارے میں اتنے ہی لائیکل سوالات نہیں کیے جاسکتے؟ روح کیا ہے؟ فکر و حیات اس کے افعال ہیں یا ماہیت؟ وہ ازلی ہے یا مخلوق؟ فانی ہے یا ناقابل فنا؟ انسانی روح اور روح برتر (خدا) میں کیا علاقہ ہے؟ خدا نفوس انسانہ پر کیونکر تصرف و عامل ہے؟ خود خدا کی ہستی سے متعلق اس سے بھی بڑھ کر محیر العقول پیچیدگیوں کا دھا بھونتی ہیں۔ اسکی ازلیت، نامحدودیت، عالم الغیبی وغیرہ سیکڑوں صفات میں سے کسی ایک کا بھی ہماری سمجھ میں آنا قطعاً ناممکن ہے، برکے نے نفس انسانی اور خدا کی نسبت ان گریہوں کے کھولنے کی کوشش کی ہے، اور مبادی کا آخری حصہ (بند ۸۵-۱۵۶) کہنا چاہیے کہ کل کا کل انہی چیزوں کی نذر ہو گیا ہے۔ لیکن تم خود اس کو پڑھ کر انصاف سے بتلاؤ کہ اسکی بساط کچھ بھی مدرسمہ یا ہمارے متعلمین کے اُس طلسم الفاظ سے زیادہ ہے جسکی برکے نے مقدمہ مبادی اور دیگر تصانیف میں جا بجا ہنسی اڑائی ہے۔

اب رہا تشکیک و ارتیابیت کے سد باب کا دعویٰ تو اس میں کلام نہیں کہ جتنا خود برکے کے ذاتی اذعان کا تعلق ہے، تاریخ فلسفہ میں شاید ہی کوئی فرد اُس سے زیادہ ارتیابیت کا دشمن مل سکے لیکن اسکو خبر نہ تھی کہ نادانستہ وہ خود اپنے حریف کے لیے راستہ صاف کر رہا ہے اور یعنی اُسکی تصویریت سے زیادہ فلسفہ کا کوئی مذہب تشکیک کی پشت پناہی نہیں کر سکتا۔ بظاہر تو یہ بات بالکل بدیہی معلوم ہوتی ہے کہ جب ہم اپنے تصورات ذہنی یا احساسات کے ماوراء کسی شے کے قائل ہی نہیں تو لامحالہ اس شک کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکلتی کہ ہمارے احساسات موجودات خارجی (مادہ) کے کسی حد تک مطابق اور نمایندہ ہیں یا سرے سے کچھ بھی مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں جب محسوسات کی کل حقیقت ہمارا احساس ذہنی ہی ہے، اور اپنے احساسات ذہنی

کے وجود میں شبہ ناممکن ہے کہ ان سے زیادہ اور کیا چیز عیان تر ہو سکتی ہے۔ تو اب پھر اشتباہ و تذبذب کا محل ہی کیا ہے؟

لیکن اصل یہ ہے کہ اولاً تو تشکیک کے یہ معنی نہایت محدود ہیں اور دشمن کے کسی ایک قلعہ کی تخریب سے اسکی شکست کا کیونکر یقین و اعلان کیا جاسکتا ہے۔ مان لیا کہ محسوسات کا کوئی خارجی عمل (مادہ) نہیں ہے، ایسے اُسکے علم و عدم علم کی بحث لایعنی نہ ہے۔ لیکن یہ خلش اب بھی باقی رہ جاتی ہے کہ احساسات یا تصورات کیونکر پیدا ہوتے ہیں؟ خود نفس مدرک ہی ان کا خالق ہے یا کوئی اور ذات؟ نفس مدرک یا اُس ذات آخر کی کیا ماہیت ہے؟ تخلیق تصورات کی کیا غایت ہے؟ یہ اور اس قسم کے سیکڑوں دوسو سن میں سے کیا ایک کا بھی فیصلہ کن جواب دیا جاسکتا ہے؟ یا ایک لمحہ کے لیے بھی یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ایک بات بھی ہمارے لیے اُس طرح غیر مشتبہ اور برہمی ہے جس طرح اپنے تصورات ذہنی کا نفس وجود و مگر ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے ہم دریافت کرتے ہیں کہ بے تھاء موج سمندر آتش نشان چراغ افریقہ کا صحرا، اعظم ہالیوڈ کی ہزاروں فٹ بلند چوٹیاں، آفتاب کا ہیبت ناک جرم ماری سامنے کے درخت، مکانات چلتے پھرتے جانور اور آدمی خود اپنا جسم کیا ان میں سے کسی ایک شے کے بھی وجود خارجی کی نسبت شک یا دہم شک بھی ممکن معلوم ہوتا تھا؟ کیا وہ شخص قطعی فائز عقل نہ خیال کیا جاتا، جو ان کو اپنے یاد و سروں کے محض ذہنی تصورات قرار دیتا؟ لیکن تم نے دیکھ لیا کہ برکھے نے اُسی قسم کے استدلال اور اسی قسم کی منطق سے جس سے ان چیزوں کا ناممکن الشک وجود خارجی ثابت کیا جاتا تھا، اُس طرح انکو محض ذہنی کر دکھایا کہ ہم کو خود اپنے وجود میں شک ہونے لگا، یہ ظاہر ہے کہ برکھے کے دلائل دنیا کی

اعتقاد کو نہیں ہٹ سکے لیکن کیا ایک سوچنے والے دماغ میں ان سے طرح طرح کے شکوک اور وسوسے نہیں پیدا ہو گئے؟ تصویریت کا نظریہ بے شبہ اٹل نہیں ہے، لیکن کہا اسکی صحت کا کم از کم امکان و احتمال نہیں پیدا ہو گیا، اس نظریہ کی شک آفرین قوت ہی تھی جس نے پرسپیٹول کو جو کوئی فلسفی نہ تھا، یہ اعتراض کرنے پر بے بس کر دیا، کہ آپ کا (برکلی) خیال بھی اسی قدر اغلب ہے، جتنا وہ خیال (اشیا کا وجود خارجی جسکی آپ تردید کرتے ہیں۔ دونوں برابر درجہ کی دشواریوں سے دوچار ہیں) اس موقع پر ہم اتنا بے کسے نہیں رہ سکتے کہ برکلی کے فلسفہ کی تائید و تردید میں سیکڑوں اور ہزاروں صفحے لکھے گئے ہیں لیکن پرسپیٹول کے اس ایک جملہ میں فلسفہ تصویریت کی جتنی صحیح اور جامع تنقید موجود ہے، دوسروں کے دفتر میں بھی نہیں، سچ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک سلیم الطبع عامی آدمی کا ذہن جس نکتہ پر پہنچ جاتا ہے فلسفی کا، کچھ رو اشکال پسند دماغ اسکو نہیں پاسکتا۔

غرض یہ ہے کہ برکلی کی تصویریت اذعان بخشی کی طاقت تو نہیں کھتی لیکن دلوں میں شک انداز می کے لیے وہ کافی سے زیادہ قوی ہے۔ اور یہ دیکھ کر کہ جس چیز کو (اشیا کا وجود خارجی) کہنا چاہے کہ ایک برہمی اور اٹل حقیقت تعین کیا جاتا تھا اسکو محض ایک ہوائی قلعہ اور بے بنیاد شے ثابت کیا جاسکتا ہے، ایک غور کرنے والے آدمی کا اعتماد اپنے علم و استدلال پر سے قطعاً اٹھ جاتا ہے اور وہ ناچار کم از کم عالم فکر میں تشکیک مطلق میں گرفتار ہو جاتا ہے، برکلی نے جس حربہ کو دشمن کا قاتل خیال کیا تھا، وہ دراصل اسکی حمایت کا سب سے زبردست آلہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ علم کی رسائی لاعلمی سے آگے نہیں۔ اور فلسفہ کا منتہا بس یہی ارتیاب میت و لاعلمی ہو کہ، معلوم شد کہ سچ معلوم نیست۔

عام تبصرہ

عائد کے بازگویم از بسیار

انگلستان کے مشہور شاعر اور برکلی کے معاصر الکزنڈر پوپ نے لکھا ہے کہ آسمان کے تلے کوئی فضیلت نہیں جو برکلی مین نہ ہو۔ یہ خالی شاعری نہیں ہے۔ پوپ کے شعرا ایران کے بھاٹ نہیں ہوتے، کہ شیطان کو فرشتہ یا آدمی کو خدا کہہ دیں، انکا مبالغہ پس لطف شاعری کی حد تک ہوتا ہے، پھر پوپ تو ان بدنام جھوٹا اور حاسد شعرا میں ہے جسکی زبان سے بہت ہی کم کسی حریف عصر کی تعریف نکلی ہے تم خود برکلی کی سوانح پڑھ کر تصفیہ کر سکتے ہو کہ فضل و کمال کی ایسی بے داغ تصویرین قدرت کا ہتھ ہر روز نہیں کھینچا کرتا۔ عقرنہا باید کہ تا انجہ، اس کا دامن ذہنی کمالات کے ساتھ حسن سیرت اور حسن عمل کے موتیوں سے یکساں طور پر لبریز ہے

عام عادات و اخلاق اتنے دلکش اور بات چیت اس قدر عالمانہ ہوتی تھی کہ اپنے وقت کے زبردست عالم البشپ اٹھر برمی کی زبان سے اولین ملاقات میں یہ الفاظ نکلے کہ ”اتنی عقل، اتنا علم، اتنی معصومیت، اتنی تواضع، جب تک میں نے اس شریف زادہ کو نہیں دیکھا تھا صرف فرشتوں کا حصہ خیال کرتا تھا،“ خود داری کا یہ عالم کہ اپنی ذات خاص کے لیے زندگی بھر کسی کا منت کش نہ ہوا۔ آرج بشپ جیسے جلیل القدر منصب کے

ساتھ اس کا سب سے مشہور کا زمانہ ہو مگر ترجمہ ہے جو گوئی، معاصرین کے ساتھ علمی حسد اور کینہ دہی کے لیے بنام ہے۔

حصول کے لیے بھی باوجود احباب کے شدید اصرار کے کسی کے سامنے ایک جنبش تک
 روانہ نہ رکھی۔ ابنائے جنس کی خدمت کے دلولہ اور قناعت دانیہ رکایہ حال کہ ۱۱۰۱۱ سوال
 پوڈ کی ڈنیر می کوٹھکر اکروطن سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر نئی دنیا کا ایک خاموش
 گوشہ (جزیرہ رھوڈ) جا بسایا۔ اہل وطن کی فلاح و بہبود کے لیے تو آخری عمر کے پورے
 ۷۰ برس وقف کر دیے۔ عیلت کی یہ انتہا کہ فلسفی ہو کر سوت کاتنے کا کارخانہ چلاتا تھا۔
 بیکاروں کو مشغول بنانے اور غربا کو روزی سے لگانے کے لیے سن کی کاشت شروع
 کی۔ ہودیشی کی بہت افزائی کے لیے آئرلینڈ کے جلاہوں کا بنا ہوا بدترین کپڑا استعمال
 کرتا تھا۔ تقدس اور عبودیت کا یہ رنگ کہ بارہ بارہ شب کو اٹھ کر عبادت کرتا تھا،
 گفتگو میں اس درجہ محتاط کہ زبان سے کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں سنا گیا۔ منبر کی زندگی میں وہ
 بہترین شوہر، مربی بھائی، فرض شناس باپ اور حق شناس آقا تھا، چھوٹے بھائیوں کی
 تعلیم کا پورا کفیل رہا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں مزدور معین پر بھروسہ نہیں رکھتا تھا۔ ان کی
 ایک ایک حرکت اور ادا کی خود نگرانی کرتا تھا۔ آقا یا نہ حق شناسی یہ کہ بی بی کی لڑکی کی
 نرس کی پرورش کے لیے سالانہ باندھ دیا تھا تو بھلا خود اپنے ملازمین سے کیا کیا حسن سلوک
 نہ کرتا ہوگا۔ ان تمام باتوں کے ساتھ نفاست پسند زندگی اور دنیا کی نعمتوں سے متنعم نہ
 فلسفیت کے منافی جانتا تھا اور نہ مذہب کا گناہ۔ اس کے اصطل میں چھ گھوڑے بندھے
 تھے، اس کا مکان آرائش کی چیزوں سے سجا تھا، وہ اچھا اور ہوشیار اور چری رکھتا تھا۔
 اب اس کی ذہنی زندگی کا صفحہ الٹ کر پڑھو تو اسٹورٹ مل نے لکھا ہے کہ برکے
 کے عظیم الشان انکشافات نے اس کے پہلے اور بعد کے علم النفس اور ما بعد الطبعیات میں استبداد

فرق و اختلاف پیدا کر دیا ہے، جتنا نئی اور پرانی تاریخ یا قدیم و جدید طبعیات میں جھجھکیں
 (مبادی نفسیات، جزم صفحہ ۷۷)، جو تصورات کلیہ کے منکر اور فلسفہ تصویریت کے بانی کا بید
 دشمن ہے، اسکو بھی اتنا اعتراض کرنا پڑا کہ رکھے کا نظریہ رویت نفسیات کی غیر منفک کر دی ہو
 فکر و اجتہاد اُسکے تمام علمی کارناموں کی روح ہے، تقلید سے زیادہ وہ کسی چیز کو
 سنگ نہیں خیال کرتا۔ اپنے دائرہ سے باہر بھی جس شے کو ہاتھ لگا دیا، اس میں وہ نکتے
 زبان سے نکلتے جو آگے چل کر فن کے ابواب بن گئے۔ علم الاقتصاد میں مستقر کے اشارات
 نے آدم اسمتھ کی پیش روی کی ہے، علم الاخلاق میں افادیت کے اُس دقیق اصول
 پر نظر پہنچی، جو آج اخلاقیات کا سب سے مقبول نظریہ ہے۔ نظریہ تعلیل میں ہیوم کا رہنما ہے
 اُسکے مکالمات انگریزی کے لٹریچر الہیات کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ
 انگلستان کا فلاطون اور سوسٹر ہے، دستِ نظر کا یہ نقشہ کہ مصر و یونان، قدیم و جدید فلاسفہ
 اور حکماء (علمائے سائنس) میں ایک ایک سے باخبر ہے اور اچھی طرح باخبر ہے، ہمہ گیری
 کی یہ کیفیت کہ اُسکے عہد تک حکیات کے مختلف شعبوں نباتات، حیوانات، تشریح، کیمیا،
 عضویات، میکانک، علم المرایا، اور طبعیات، وغیرہ میں جو کچھ تحقیقات ہو چکی تھیں سب پر علمائے
 اطلاع رکھتا تھا۔ ریاضیات میں تو خدا سے ریاضی نیوٹن کے بعض سائل کی سطح
 و مہمان اُلٹا، میں کہ علمائے ریاضی سے مدون جواب نہ بن آیا۔ اسکی ہمہ گیری صرف عقلیات
 تک محدود نہ تھی، وہ یورپ بھر کی تجارت، زراعت، صنعت و حرفت وغیرہ پر اسقدر حادی تھا
 کہ اس زمانہ میں اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ واقفیت سطحی نہ تھی بلکہ اعداد و شمار کا
 حافظ تھا، آئرلینڈ میں فنون لطیفہ نے اُسی کے گھر سے رواج پایا، غرض صاحبِ نظریہ کے لیے
 اسکی زندگی کا ہر رُخ دلکش اور سبق آموز ہے، غرض شناس کہ ہر نکتہ ادا سے دارد۔

ضمیمہ

تصورات کلیہ

”مبادی علم انسانی“ کے مباحث کی تلخیص کے وقت ”تصورات کلیہ“ کے ”مقدمہ“ سے صرت اس بنا پر قرض کیا گیا تھا کہ اس پر مختصراً ایک مستقل مضمون لکھا جا چکا ہے (دیکھو کتاب ہذا صفحہ ۷۳)

لیکن چونکہ یہ بحث بقول ہیوم کے اس قدر اہم ہو کہ ”میں اس کو عہد جدید کے سب سے عظیم الشان اور دقیقہ افشا فات میں سمجھتا ہوں“ (کتاب فطرت انسانی، حصہ اول، فصل ۷) اس لیے بطور ضمیمہ کے اس مضمون کا داخل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سقراط کا قول ہے کہ کسی چیز کا صحیح علم بلا تصور کلی کی جانب رجوع کیے ناممکن ہو، ارسطو تصور کلیہ باذاتیات اشیاء کی جستجو ہی کو سقراط کا واحد فلسفیانہ کا نام نہ خیال کرتا ہے (الہیات ارسطو، ذکر سقراط، خصوصاً الہیات کی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑہ، قریباً ڈھائی ہزار سال سے یہی مجہدات یا کلیات ہیں، ریاضیات کے حدود و اصول سراپا مجہدات ہیں، علوم طبیعیہ جن کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہے ان کا قدم بھی بے وضع کلیات کے نہیں اٹھتا، ہماری روزمرہ کی گفتگو یا تحریر میں اس جملے بھی ایسے مشکل سے مسکین گے جو الفاظ کلی کے استعمال سے خالی ہوں۔ کیا ایک ایسی شے کے وجود و اقمی سے، جس کا استیلا اور جسکی احتیاج اس قدر عالمگیر ہو، انکار یا شبہ انکار بھی ممکن ہے۔ ۳۰ اپریل ۱۹۰۷ء کے روزنامہ بین قارئین کی توقع کے خلاف اس سوال کا جواب یہ پاتا ہوں ”مغایہم کی تقسیم کلی اور جزئی صحیح نہیں معلوم ہوتی، یا تمام مغایہم کلی میں یا تمام جزئی، صورت

ثانی قابل قبول ہے، پھر ہر اگست ۱۹۵۷ء میں یہ ملتا ہے ”زبان میں الفاظ کلی موجود ہیں ان کا استعمال اس قدر کثیر اور ناقابلِ اعتناء ہے، کہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ ذہن میں کوئی واقعی مصداق کلی بھی موجود ہے، ورنہ دراصل ذہن مصداق کلی کے تصور سے بالکل عاجز ہے، اسی بنا پر جب کسی حکم کا محکوم علیہ کلی ہو تو ذہن کے سامنے کوئی نہ کوئی جزئی آ جاتا ہے اور بر بنائے تشیل وہ تمام افراد پر مجملاً حکم لگا دیتا ہے۔“ برکلی نے اپنی کتاب ”مبادی علم انسانی“ پر جو مقدمہ لکھا ہے ادھر اُس پر نظر پڑی، وہ تمام تر اسی بحث سے متعلق ہے۔ فلسفہ کی نشاۃِ جدیدہ کے اس بلند پایہ فرزند کے ساتھ تو اردو ذہنی بہت بندھائی ہوئی کہ اس موضوع پر پنجبالہ افکار کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کر دین اور خود اس مقدمہ کو بھی اُردو میں ہر یہ ناظرین کر دین جس کو اس سلسلہ پر خاتم المباحث کہنا چاہیے۔

کلیات کا مسئلہ علی العموم فنِ منطق کا ایک ٹکڑا خیال کیا جاتا ہے، جو ایک حد تک بجا بھی ہے، لیکن تجرّدات یا کلیات کی ماہیت، ان کا نشا اور ان کی حقیقت ذہنی کو روشنی میں لانے کے لیے دراصل نفسیاتی بحث سے فکر و تامل کرنا چاہیے۔ یہاں تک پہنچ کر بے خیال آبا کہ اس بحث پر نفسیات کے امام اعظمِ دہلیم حمیس کا فیصلہ معلوم کیے بغیر قلم کو آگے بڑھانا، اس کی پایہ شناسی سے زیادہ اپنی کم نظری کا ثبوت ہوگا، نہایت ذوق و شوق سے اسکی مشہور کتاب ”مبادی نفسیات“ کا گیارھواں باب جو اسی بحث سے متعلق ہے کھولا۔ اور حسن گمان کے ساتھ پڑھنا شروع کیا، کہ بس اب تھوڑی دیر میں ساری گرہیں کھلی جاتی ہیں لیکن حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ برکلی کی تیز شعل کے سامنے موجود ہونے پر بھی اسکی مجتہدانہ نگاہ و ذہن اب برس کے پردہ آ

نظمت کو نہ چیر سکی اور بالآخر اچھا دنے روایت سے شکست کھائی، استعجاب سے زیادہ
 تاسف انگیز بات ہے کہ عالمِ نفیات کی حیثیت میں بجائے اسکے کہ ایسے اہم مسئلہ کی ذہنی
 تحلیل و تشریح کرتا۔ اپنی عام عادت کے خلاف مل وغیرہ کے چند اقتباسات کی مناظرانہ اور
 انشا پر دازانہ تنقید پر قناعت کی ہے۔ مجبوراً اب ہم رہنمائے وحید شہب برکلی کا ہاتھ پکڑ کر
 چلتے ہیں۔ سب سے پہلے سہولتِ فہم کے لیے مجردات و کلیات کی توضیح ضروری ہے اور امید ہے
 کہ اسی توضیح کی روشنی میں اربابِ تامل کی نگاہیں جادہ استقامت کو پالیں گی۔

زبان میں دو مختلف قسم کے لفظ موجود ہیں۔ ایک مثلاً چنگیز خان۔ پولین، ہومر، فردوسی
 اسپنسر، ابن سینا وغیرہ، دوسرا انسان۔ اسی طرح لندن، پیرس۔ اسکندریہ، کلکتہ وغیرہ اور
 شہر، اٹرن۔ عربی، لوسٹینا وغیرہ (خاص خاص جہازوں کے نام)، اور جہاز، مبادی، نفیات
 گلستان، شعر، لعم وغیرہ اور کتاب یا گلڈ، آل، قصر، حرا، تاج محل وغیرہ اور عمارت، ان میں
 پہلی قسم کے الفاظ جزئی کہے جاتے ہیں اور انسان، شہر، کتاب، عمارت یا ان کے مثل
 الفاظ کا نام کلیات ہے۔ ایک دوسری صورت یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ سفید، تھوڑا سفید
 کاغذ، سامنے کی آگنی، بھو، الاسفید کوٹ لو۔ اور دوسری طرف محض سفیدی یا اسی طرح ایک
 جانب اپنا لکھنے والا ڈیڑھ گز کا لمبا، مستطیل میز، اپنے ہاتھ کا ۶-۱۰ انچ والا قلم۔ ایک فٹ کا لمبا کاغذ
 جس پر لکھ رہے ہو، رکھو، اور دوسری طرف صرف لمبائی، ان میں ثانی الذکر یعنی سفیدی لمبائی
 یا اسی قبیل کے لفظوں کو ”مجردات“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اول الذکر کو ”مولفات“
 کہہ سکتے ہو۔

اب تقسیم اول کے پہلے قسم میں مثال کے طور پر تاج محل لو۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے
 مراد وہ خاص عمارت ہے جو آگرہ میں جننا پر واقع ہے جسکی کرسی ۲۸ فٹ بلند ۳۳ فٹ

مرجع ہے جسکے چاروں گوشوں پر ۳۱۳ فٹ کے اونچے مینار ہیں، وسط میں ۱۸۶ فٹ مربع گہری
 مقبرہ ہے۔ یہ ساری عمارت سفید سنگ مرمر کی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن نفس لفظ عمارت کے
 معنی میں نہ تو مرجع ہونے کی تخصیص سے نہ مستطیل نہ مدور نہ مثلث نہ سنگ مرمر کی شرط ہے
 نہ سنگ موسیٰ کی نہ اینٹ کی، نہ لکڑی کی نہ مٹی کی۔ یہی حال ادنیٰ کا ہے، یا یوں کہو
 کہ یہ لفظ بول کر ہم یورپ، ایشیا، افریقہ، امریکہ، اسٹریلیا، کمین کا کوئی مکان کسی شکل کسی
 مصالح کسی ضرورت کسی حیثیت کا بنا ہو سب کو کیساں طور پر مراد لے سکتے ہیں، ان مادی
 معنوں کا نام علی الترتیب ”مفہوم جزئی“ اور مفہوم کلی ”رکھ لو۔ یہ ان دو مختلف قسم کے
 لفظوں کی مراد یا مفہوم کا وہ معمولی فرق ہے جسکی بنا پر ہم اپنی روزانہ زندگی میں ان کو
 دو مختلف مواقع پر استعمال کرتے ہیں اور اس مراد استعمال میں عامی اور فلسفی سب برابر
 ہیں، نزاع کی کوئی گنجائش نہیں۔

اصل بحث یہ ہے کہ ان مختلف المراد لفظوں سے ذہن میں مختلف تصورات کیا پیدا
 ہوتے ہیں؟ اگر تم نے خود تاج محل کو دیکھا ہے، تو جوفت اس کا تصور ذہن میں باندھنا
 چاہو گے، تمہارے ملاحظہ اور یادداشت کے درجہ کے مطابق اسکی دھندلی یا صاف تصویر
 ذہن کے سامنے کھینچ جائے گی در نہ اگر تم نے اس کی نقل و تصویر دیکھی ہے، یا صرف تھوڑا
 بہت حال سنا ہے، تو تمہید ایک تصویر تیار کر دیکھا۔ جو اصل سے بہت سی باتوں میں مختلف
 ہونے پر بھی مجموعاً اس سے بہت کچھ مشابہ ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ اسی طرح اگر ہم لفظ عمارت
 سے کوئی تصور باندھنا چاہیں تو وہ کیا ہوگا؟ آیا وہ نوع عمارت کے تمام ممکن الوجود افراد جزئیہ
 کے ماہ الاشرکات کی ایک ایسی جامع مانع تعین تصویر ذہنی ہوگی جو گذشتہ موجودہ آئندہ
 تمام خاص خاص عمارات کو عنوی ہوگی (اگر ذہن کلیات کی کوئی ایسی مشخص تصویر کھینچ سکتا ہے)

تو اسی کا نام تصور کلی ہے جو اس مضمون کا عنوان ہے، یا وہ کسی ایک خاص فرد عمارت کا تصور مع اپنے تمام جزئی خصوصیات کے ہوگا۔ لیکن ذہن یہ فرض کر سکتا ہے کہ یہ خصوصیات عمارت کی حقیقت نوعی میں داخل نہیں۔ پہلے نظریہ کا اصطلاحی نام تصویریت ہو جو ہر کچلے کے قریباً تمام پیشرو فلاسفہ کا مذہب ہے اور دوسرا سمیت کے نام سے مشہور ہے جو خود ہر کچلے اور اُس کے اتباع کا مذہب ہے۔

یہاں تک تم نے تصور کلی کی حقیقتِ معارف کو ابھی طرح سمجھ لی۔ اب ہم تصور مجرد کی کسی قدر توضیح کرتے ہیں۔ گو میرے نزدیک مجرد اور کلی الفاظ میں کوئی خاص معنوی فرق نہیں لیکن علی العموم الفاظ کی یہ تقسیم کی جاتی ہے، اور موجودہ بحث پر اس تقسیم کی صحت و عدم کا کوئی اثر نہیں اس لیے یہاں اس قضیہ کا چھیڑنا بے محل ہے اور مجردات کی مثالیں سفیدی اور لبائی بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح مکانت۔ شجریہ۔ انسانیت۔ مثلثیت۔ مربعیت۔ وغیرہ سب اسکی مثالیں بن سکتی ہیں۔ تمہارے سامنے سفید پتھر کا ایک مربع میز رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میز کا جزئی تصور پتھر، سفید۔ اور مربع وغیرہ متعدد چیزوں سے مرکب ہے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ کیا ذہن کے لیے یہ ممکن ہے کہ اس میز کے تمام اذر جزئیات اور خصوصیات کو چھوڑ کر محض سفیدی، محض ربع پن، یا محض جبریت کا متعین تصور قائم کر سکے اگر وہ ایسا کر سکتا ہے تو بس یہی "تصور مجرد" ہے۔

تصور مجرد کا فرق پوری طرح ذہن نشین رکھنے کے بعد یہ بالکل صاف ہے کہ مفہوم کلی اور مفہوم مجرد کوئی بحث اور اختلاف کی شے نہیں کیونکہ اس سے کون انکار کرے گا کہ انسان بول کر کوئی خاص فرد، زیرِ عمر وغیرہ نہیں مراد لیا جاتا، بلکہ نوع انسان کے تمام افراد اور لبائی سے کسی خاص شے قطب بنار یا اہرام مصری کی لبائی نہیں سمجھی جاتی بلکہ ہر مقدار والی شے

کی لبائی، ان جس چیز میں جھگڑا ہے، وہ کلیات و مجردات کا مفہوم نہیں۔ بلکہ تصور ہے یعنی یہ کہ کلی یا مجرد الفاظ کا ذہن میں کوئی ایسا ہی وسیع اور مشخص مصداق ہوتا ہے۔

لیکن میرے نزدیک ذرا سوچنے کے بعد تصور کلی یا مجرد کا نامکمل الوجود ہونا اتنا ہی صاف ہے جتنا مفہوم مجرد یا کلی کا ناقابل نزاع ہونا۔ بلکہ اس سے زیادہ اگر تم انسان کا تصور اپنے ذہن میں بانٹنا چاہو تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ وہ آدمی کی ایک ایسی فیضی تصویر ہو۔ جس کا رنگ نہ گورا ہو۔ نہ کالا۔ نہ سادہ نہ دلانہ کوئی اور۔ اس کا نقشہ نہ چینی ہو۔ نہ عربی۔ نہ ہندی، نہ مصری۔ نہ فرنگی نہ کسی اور ملک کا۔ اس کا قد نہ دراز ہو۔ نہ میانہ نہ پست۔ اس کا لباس نہ انگریزی ہو۔ نہ جاپانی نہ ترکی، نہ افغانی۔ نہ عربانی، وہ نہ عورت ہو، نہ مرد، نہ بچہ نہ بوڑھا نہ جوان۔ اور پھر سب کچھ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ ہزاروں اضداد و تقاضی کے رفع و اجتماع کا ہیولی ہو۔ میں نہیں جانتا کہ زمین کا بسنے والا آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی ایسا تصور اپنے ذہن میں قائم کر سکتا ہے۔ یہی حال مجردات کا ہے، ذرا توجہ سے غور کرو کہ کیا سفیدی کا کوئی ایسا منظرہ تصور تھا رے ذہن میں آ سکتا ہے جو نہ برت کی سفیدی ہو۔ نہ روئی کی۔ نہ سنگ مرمر کی نہ چونہ کی۔ نہ سیپ کی۔ نہ ہلکی، نہ گہری اور ساتھ ہی سب کو شامل ہو یا تھا رے ہاتھ میں سُرخ چڑے کا ایک گیند ہے تو کیا ذہن کے لیے یہ ممکن ہے کہ رنگ وغیرہ کے تمام خصوصیات کو چھوڑ کر صرف گولائی کا تصور قائم کر سکے؟ یقیناً معمولی تامل کے بعد ہر شخص ان سوالات کا جواب نفی میں دے گا۔

ایک شبہ یا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ذہن مجرد یا کلی تصور قائم کرنے سے عاجز ہے تو پھر احکام کلیہ کا تعلق کیا محض کلی الفاظ سے ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ خارج میں کسی کلی کا وجود نہیں مثلاً جب یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ شلٹ کے تینوں زاویے دو قانون کے برابر ہیں

تو معلوم ہے کہ بیان کوئی خاص مساوی الساقین، مساوی الاضلاع، یا مختلف الاضلاع مثلث
مراد نہیں۔ بلکہ بلا تخصیص ہر ایک مثلث، اور خارج میں جو مثلث ہو گا وہ ان تمام فیروں کے
سعرانہیں ہو سکتا۔ لہذا اس حکم کے لیے صرف لفظ مثلث رہ جاتا ہے۔ جو کسی معنوی حقیقت کا
محکوم علیہ نہیں بن سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ احکام کلیہ کا محکوم علیہ، نہ تو کوئی خارجی ہوتا ہے، نہ تصور ذہنی نہ
خود لفظ کلی۔ بلکہ الفاظ کلیہ یا مجردہ کے وہ معنی مراد می جن کا نام اور پر مفہوم کلی اور مفہوم مجرد
رکھا ہے اب اپنی زیر اعتراض مثال میں دیکھو کہ مطلق مثلث بول کر مراد کیا ہوتی ہے۔ ایک
ایسی سطح جو تین مستقیم خطوط سے گھری ہو۔ جو دوسرے لفظوں میں مثلث کی تعریف کہی جاتی ہے
اور جہین خطوط کی باہمی نسبت کا کوئی ذکر نہیں، بس یہی مراد استعمال مثلث سے متعلق تمام
احکام کلیہ کا محکوم علیہ ہے، ایک کلیات و مجردات پر کیا موقوف ہر زبان میں سیکڑوں ایسے
جزئی الفاظ موجود ہیں، جنکے مصداق کا نہ ذہن میں تصور ممکن ہے، نہ خارج میں کبھی حواس
سے علم ہوا۔ لیکن وہ دن رات استعمال ہوتے ہیں۔ اور بیسیوں احکام کا محکوم علیہ بنتے ہیں
خدا، جبریل، شیطان، روح وغیرہ سب اسی طرح کے الفاظ ہیں کہ جن کے مصداق کا نہ کبھی
حسی مشاہدہ ہوا، نہ ذہن میں ان کا کوئی واضح اور تعین تصور ہے۔ ان کی نسبت ہم جو کچھ
کہتے سنتے ہیں، اس کا تعلق صرف معنی مراد می سے ہوتا ہے مثلاً مشکلمین کے نزدیک خدا
سے مراد ایک ایسی غیر مادی ہستی ہے جو نہ زمین پر ہے، نہ آسمان پر نہ مشرق میں نہ مغرب میں
نہ شمال میں۔ نہ جنوب میں۔ جسکی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اُس کے کان نہیں گروہ سنتا ہے
اُسکے آنکھیں نہیں گروہ دیکھتا ہے۔ بناؤ تمہارے ذہن میں ایک آن کے لیے بھی ایسی
ہستی کا تصور آ سکتا ہے؟ قطعاً نہیں۔ پھر تم کہتے ہو کہ خدا زاق ہے، خالق ہر قادر مطلق

ہے۔ قمار ہے۔ بس معلوم ہوا کہ ان تمام صفات یا احکام کا تعلق اُسی معنی مراد سے ہے، نہ کہ تصور ذہنی یا لفظ خدا سے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ عامی آدمی کے معنی مرادی ایک متکلم اور فلسفی سے مختلف ہوں بلکہ ہوتے ہیں؛ ہندسہ کے بہت سے اصطلاحی الفاظ مثلاً نقطہ، خط، سطح وغیرہ بھی اسی صنف میں داخل ہیں، کون ذہن ایسے طول کا تصور کر سکتا ہے جس میں عرض اور عمق نہ ہو؛ لیکن خط ایسے ہی طول کا نام ہے، اور اُس پر اقلیدس کے صد احکام جاری کیے جاتے ہیں، کیا ان کا تعلق سوائے معنی مرادی کے کسی اور شے سے ممکن ہے۔ یہی حال نقطہ اور سطح کا ہے۔ اسکو بھی چھوڑ دو تم کہتے ہو کہ اجتماع نقیضین محال ہے۔ بتاؤ اس محالیت کا تعلق کس سے ہے؛ خارج میں اجتماع نقیضین کا وجود نہیں۔ ذہن اس کے مصداق کا تصور نہیں کر سکتا۔ لامحالہ حکم کا تعلق معنی مرادی سے ہے۔ یعنی کسی شے کا تمام حیثیات سے ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں موجود ہونا اور معدوم بھی ہونا۔

اصل یہ ہے کہ کلیات اور مجردات بھی ایک طرح کے اجتماع و ارتفاع تناقضات کا نام ہیں، اس لیے نہ خارج میں ان کا وجود ممکن ہے نہ ذہن میں تصور جب بہ وقت واحد انسان کے مفہوم میں جشی اور رومی دونوں داخل ہیں۔ تو سیاہ سفید آدمی کا تصور اس سے زیادہ آسان نہیں جتنا مثلث مربع کا۔

اس میں شک نہیں کہ کلی اور مجرد الفاظ کے استعمال سے معنی مرادی کے ساتھ ساتھ کبھی ذہن میں متعین تصور بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تصور ہمیشہ کسی ایک فرد جزئی یا یکے با دیگرے متعدد افراد جزئیہ ہی کا ہوتا ہے۔ فرض کرو جب تم نے پہلے پہل اللہ آباد کی نمائش یا کسی موقع پر ہوائی جہاز دکھیا ہوگا، تو جب ہوائی جہاز کا نام آتا ہوگا، تمہاری آنکھوں کے سامنے اُسی دیکھے ہوئے جہاز کا نقشہ پھر جاتا ہوگا، لیکن اگر گفتگو کا تعلق اس خاص جہاز سے

نہ ہو تو نیشنل کی بنا پر ذہن مین یون قسیم پیدا کر لیتا ہے، کہ یہ اور اس جیسے تمام دیکھے اور
 اُن دیکھے جہاز مرد ہین۔ پھر جب ہم روزانہ اخبارات مین ہوائی تاخت کا حال پڑھتے ہین
 تو تو دو کی وجہ سے ذہن ہوائی جہاز کے صرف معنی مرادی پر قناعت کرتا ہے اور کسی جزئی
 جہاز کا تصور ذہن مین آنا لازمی نہیں ہوتا۔ اس طرح جب تم اول اول دیہات یا اپنے گھر سے
 بچپن مین ریل کے سفر کے لیے نکلے ہو گئے، تو جہان تمہارے لیے ٹکٹ خرید لیا ہو گا اور
 ریل پر سوار ہوئے ہو گے تو سنا ہو گا کہ لوگ اس جگہ کو اسٹیشن کے نام سے پکارتے ہین۔
 چلتے چلتے ایک جگہ ریل ٹھہری ہوگی اور بہت سے نئے مسافر سوار ہوئے ہوں اور بہت سے
 اُتر گئے ہوں گے۔ تمہارے ساتھیوں نے کہا ہو گا کہ یہ فلاں اسٹیشن ہے آخر ایک جگہ تم
 خود اُتر پڑے ہو گے، اور اتنے تجربہ سے سمجھ لیا ہو گا کہ اسٹیشن سے مراد وہ جگہ ہوتی ہے
 جہاں ریل کچھ دیر ٹھہرتی ہے۔ پچھلے مسافر اُترتے اور نئے سوار ہوتے ہین، اب مطلق اسٹیشن
 کا نام لیا جائیگا، تو شروع شروع مین اکثر اُس سے پہلے اسٹیشن کی تصویر تمہارے سامنے
 پھر جائے گی جہاں تم دیر تک ٹھہرے، سوار ہوئے، اور استلافات ذہنی کے قانون نے
 اُسکے تصور کو ذہن مین زیادہ راسخ کر دیا ہے۔ بارہا ایسا بھی ہو گا کہ دوسرے دوسرے اور
 جو نئے اسٹیشن کی بھی ایک دُھندلی سی تصویر سامنے آجائے گی، لیکن ذہن ان جزئیات
 سے نیشنل کا کام لیتا ہے، باقی احکام کلیہ کا تعلق اسٹیشن کے اسی معنی مرادی سے رکھتا ہے
 جہاں ریل رکتی اور مسافر چڑھتے اُترتے ہین۔

ایک بات اور یاد رکھنے والی ہے۔ تم ایک عجائب خانہ مین جاتے ہو جہاں آدمی
 کا ایک مردہ بچہ رکھا ہوتا ہے جسکے دوسرے ہین، گو تمہارے ذہن مین دوسروالے آدمی کا تصور
 نہیں ہوتا اور اس غیر معمولی مشاہدہ سے نکوبے انتہا حیرت ہوتی ہے تاہم تم اس کو ہاتھی

گھوڑے، شیر، بکری وغیرہ کے بجائے آدمی ہی کا بچہ سمجھتے ہو، ہوتا یہ ہے کہ تمہارے خزانہ
 ذہن میں سیکڑوں ہزاروں تصورات جرنی پہلے سے جمع ہیں، اب جب اس نئے تصور کا
 ان تصورات سے موازنہ کرنے ہو تو شیر، بکری وغیرہ کی نسبت زید، عمر، بکر وغیرہ کے تصور سے
 یہ زیادہ اقرب و اشبہ ہوتا ہے اس لیے بے نال اس دوسرے بچہ کو تم انسان کی صف میں
 داخل کر دیتے ہو۔ یہی حال ہر نئے تصور کا ہوتا ہے کہ جس کی سیانیت کی مدد سے اس کو تصورات
 موجودہ کے مختلف اصناف میں سے کسی ایک صنف کا فرد قرار دے لیتے ہو جس کی سیانیت
 اور عمل موازنہ وضع کلیات کا اصلی مرتبہ ہے۔ اب ہم اصل بحث کو اس درخواست پر
 ختم کرتے ہیں کہ ہمارے فیصلہ کے سقم و صحت کی جانچ کے لیے قارئین کو منطقی دلائل
 سے زیادہ، خود اپنے واردات ذہنی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

تمام شد